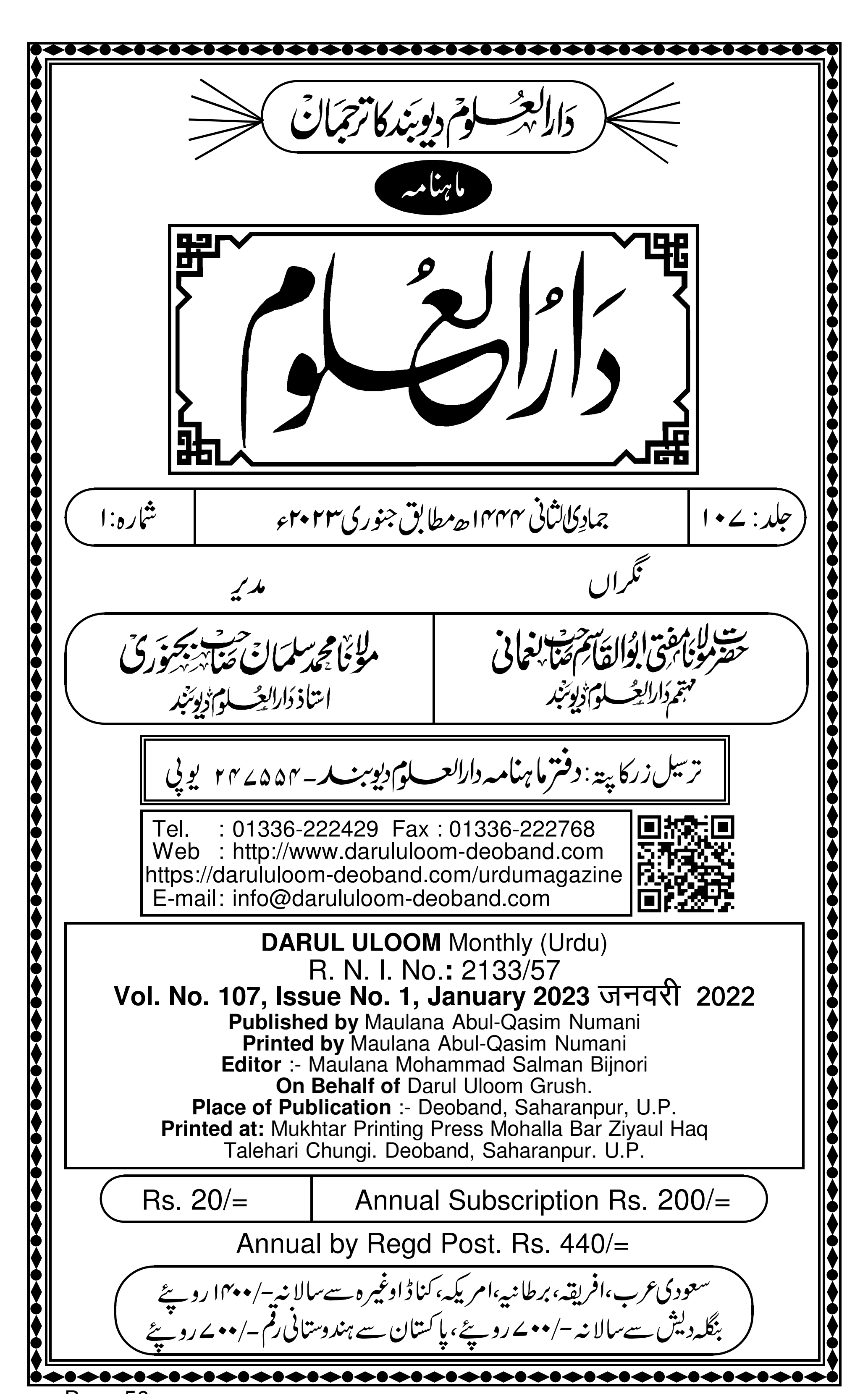


دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

شمارہ: ۱	جمادی الثانی ۱۴۴۴ھ مطابق جنوری ۲۰۲۳ء	جلد: ۱۰۷

مدیر: مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری، استاذ دارالعلوم دیوبند

نگراں: حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی، مہتمم دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند-۲۴۷۵۵۴ یوپی

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Web : http://www.darululoom-deoband.com
https://darululoom-deoband.com/urdumagazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

DARUL ULOOM Monthly (Urdu)
R. N. I. No.**:** 2133/57
Vol. No. 107, Issue No. 1, January 2023 जनवरी 2022
Published by Maulana Abul-Qasim Numani
Printed by Maulana Abul-Qasim Numani
Editor :- Maulana Mohammad Salman Bijnori
On Behalf of Darul Uloom Grush.
Place of Publication :- Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at: Mukhtar Printing Press Mohalla Bar Ziyaul Haq
Talehari Chungi. Deoband, Saharanpur. U.P.

Rs. 20/=	Annual Subscription Rs. 200/=

Annual by Regd Post. Rs. 440/=

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۴۰۰ روپے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۷۰۰ روپے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۷۰۰ روپے

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- ایک سال کے لیے اگر بذریعہ رجسٹری طلب فرمائیں تو =/440 روانہ فرمائیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

محمد سلمان بجنوری

ہمارے عزیز وطن ہندوستان میں کچھ رواج سا ہوگیا ہے کہ وقفے وقفے سے ایسے مسائل کھڑے کیے جائیں یا ایسے شوشے چھوڑے جائیں جو باشندگانِ وطن اور خاص طور پر ملک کی دوسری بڑی اکثریت مسلمانوں، کا چین وسکون درہم برہم کرڈالیں اور اس مقصد کے لیے میڈیا تو ایک عمومی اور مضبوط ذریعہ ہے ہی؛ لیکن میڈیا کے علاوہ جمہوریت کے جو باقی تین ستون ہیں یعنی عدلیہ، مقنّنہ اور انتظامیہ، ان سب کو اپنے اپنے انداز سے ایک منصوبے کے تحت استعمال کیا جاتا ہے۔

اس وقت جو مسئلہ موجب تشویش بنا ہوا ہے وہ ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا مسئلہ ہے۔ جس کے لیے بعض صوبائی حکومتوں نے پہل کی اور عدلیہ نے اس کو سہارا دیا اور قانون ساز ادارہ پہلے ہی اس کی ترغیب دے چکا ہے، اگرچہ محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہمارے دستور بنانے والوں نے آئین میں جو یونیفارم سول کوڈ کی ترغیب یا گنجائش رکھی ہے وہ مغربی دنیا کے قوانین سے متاثر ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہے؛ لیکن بہرحال اس کے سہارے ہماری حکومتوں کو اس بات کا موقع ملتا ہے کہ وہ اس موضوع کو زیرِغور لائیں۔

حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ یکساں سول کوڈ ہی نہیں اور بھی بہت سے ایسے قوانین یا فیصلے جو گزشتہ سالوں میں پارلیمنٹ یا عدالتوں کے ذریعہ سامنے آئے، مغرب کی نقالی کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتے؛ کیوں کہ اُن میں صرف مسلمانوں ہی کے مذہب اور روایات کو نہیں؛ بلکہ پورے ہندوستان کے مجموعی مزاج کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ ہندوستان اور مغربی دنیا کا موازنہ اگر کیا جائے تو یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے اکثر لوگ مذہبی مزاج کے حامل ہیں اور انھیں اپنی روایات بہت عزیز ہیں؛ جب کہ مغرب کا معاشرہ آزادی کے اُس لق ودق صحرا میں سرگرداں ہے جہاں اسے اپنی سمت سفر کا بھی اندازہ نہیں رہ گیا ہے۔

ایسے میں ہندوستان جیسے رنگارنگ تہذیبوں والے ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی بات درحقیقت زمینی حقائق کونظر انداز کرنے کے مرادف ہے،حکومت کو چاہیے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ اس ملک میں بسنے والے تمام لوگوں کے مذاہب اور تمام قبائل اور ذاتوں کی روایات کونظر میں رکھے اور پھر سوچے کہ یہ اقدام کیا، ملک میں مطلوبہ قومی اتحاد و یک جہتی کے حصول میں معاون ہوگا یا تمام شہریوں میں مزید انتشار اور بے چینی پیدا کرنے کا سبب بنے گا۔

اس کے علاوہ ایک نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ آئین میں یکساں سول کوڈ کی تو صرف گنجائش یا اجازت دی گئی ہے؛ لیکن مذہبی آزادی کو بنیادی حقوق میں شامل کیا گیا ہے اور یکساں سول کوڈ، مذہبی آزادی کے اس بنیادی حق کولازمی طور پر متاثر کرے گا، خاص طور پر اس لیے کہ مسلمانوں سمیت اکثر مذہبی طبقات کے عائلی یا تہذیبی معاملات درحقیقت اُن کے مذہبی قوانین کے پابند ہیں جن سے دستبردار ہونا اُن کے لیے ناممکن ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ صرف مسلمانوں کا نہیں ہے؛ بلکہ تمام باشندگانِ وطن کی روایات واقدار اور مذہبی آزادی کا مسئلہ ہے۔ اگر یہ صرف مسلمانوں کا مسئلہ ہوتا تب بھی سوچنا ضروری تھا کہ اتنی بڑی آبادی کی مذہبی آزادی سلب کرکے ملک کہاں جائے گا؛ لیکن یہ معاملہ تو دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے لیے بھی اتنا ہی اہم ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ، مسلمانوں کو پریشان کرنے کا اپنا شوق پورا کرنے کے چکر میں پورے ملک کی آبادی کو بے چینی اور انتشار میں مبتلا کردیں۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان سے بھی یہ گزارش کردی جائے کہ شریعت پر عمل کی آزادی، اللہ رب العزت کی عظیم نعمت ہوتی ہے، جس کی قدر کرنا ہی اس کے باقی رہنے کا ذریعہ ہوتا ہے، اس لیے ہمیں چاہیے کہ اپنی پوری زندگی میں اللہ کی شریعت کو نافذ کریں تاکہ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات ہم سے ناراض نہ ہو اور ہم اپنی شریعت پر عمل کی آزادی سے سرفراز رہیں۔

❋ ❋ ❋

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کم سنی کے باوجود رسول اکرم ﷺ کا نکاح

از: مفتی اشرف عباس قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

ام المومنین صدیقۂ کائنات، حضرت عائشہ بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہما وارضاہما، ان پاکباز اور ستودہ صفات خواتین میں سے ہیں، جنہوں نے محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے مالا مال ہوکر علم وفضل اور معرفت ودانش مندی کے وہ گہر لٹائے ہیں جس کی ہم سری دنیا کی کوئی خاتون نہیں کرسکتی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں باضابطہ آیات نازل فرما کر آپ کے ذکر کو خلود عطا کردیا اور آپ کی عفت کے ایقان کو جزءِ ایمان بنادیا، زہد وورع اور دنیا سے بے رغبتی میں بھی اپنی مثال آپ تھیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ پاک نے جس طرح سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نبوت ورسالت کے لیے انتخاب فرمایا تھا، اسی طرح آپ کی زوجیت ومصاحبت کے لیے بھی اعلیٰ صفات کی حامل ازواج مطہرات کو منتخب فرمالیا تھا؛ جن میں گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ایک خاص مقام اور امتیاز حاصل ہے۔

تعارف

آپ ام المومنین ام عبداللہ، عائشہ بنت ابی بکر صدیق، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ اور امت کی سب سے بڑی خاتون فقیہہ ہیں، آپ کی والدہ: ام رومان بنت عامر ہیں، آپ نے براہِ راست رسول اکرم ﷺ کے علم کا ایک بڑا ذخیرہ نقل کیا، اپنے والد ابوبکر نیز عمر، فاطمہ، سعد، حمزہ بن عمرو اسلمی اور جذامہ بنت وہب سے آپ نے حدیث روایت کی ہے۔ (سیر اعلام النبلا ۲/۱۴۱)

علم وفضل اور حدیث وفقہ میں امتیاز: ابن شہاب زہری فرماتے ہیں: ”لو جمع علم عائشة إلى علم جميع النساء، لكان علم عائشة أفضل“ (سیر اعلام النبلا ۲/۱۴۱)

”حضرت عائشہ کے علم کا جملہ خواتین کے علم سے تقابل کیا جائے تو عائشہؓ کا علم سب سے بڑھا ہوگا“۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو غیر معمولی ذہانت وذکاوت اور سرعتِ حفظ کی دولت سے نوازا

تھا، ابن کثیر فرماتے ہیں: ”لم یکن في الأمم مثل عائشة في حفظها وعلمها وفصاحتها وعقلها“۔ عروہ بن زبیر کہتے ہیں: ”ما رأیت أحدا أعلم بفقه ولا بطب ولا بشعر من عائشة رضی اللّٰه عنها“۔ حافظ ذہبی کہتے ہیں: ”أفقه نساء الأمة علی الاطلاق، ولا أعلم في أمة محمد؛ بل ولا في النساء مطلقًا امرأةً أعلم منها“ (امت کی خواتین میں بلاکسی استثنار کے سب سے بڑی فقیہہ ہیں اوراس امت؛ بلکہ دنیا جہاں کی خواتین میں مجھے ایسی خاتون نظر نہیں آتی جوعلم وفضل میں آپ سے بڑھی ہوئی ہو)۔

آپ نے جو احادیث روایت کی ہیں، ان کی تعداد حافظ ذہبی کے بہ قول دو ہزار دو سو دس (۲۲۱۰) ہے، جن میں سے ایک سو ستر احادیث تخریج امام بخاری ومسلم نے مشترکہ طور پر کررکھی ہے، جب کہ ۵۴ میں بخاری اورانہتر میں مسلم منفرد ہیں (سیر أعلام النبلا، ۲/۱۳۹) اس حساب سے بخاری میں آپ کی دوسو اٹھائیس اور مسلم میں دوسو بتیس روایتیں ہیں۔

زہدوعبادت

حضرت عائشہؓ کوعبادت سے بھی بڑا شغف تھا، اس کثرت سے روزے رکھتی تھیں کہ آپ پر ضعف طاری ہوگیا تھا، زہداور دنیا سے بے رغبتی کا یہ عالم تھا کہ حضرت عروہ کے بہ قول ایک بار آپ نے ستر ہزار دراہم صدقہ کردیئے؛ حالاں کہ آپ کے کپڑے پر پیوند لکھے ہوئے تھے۔ ام ذرہ کہتی ہیں: ”عبداللہ بن زبیر نے حضرت عائشہ کے پاس دوتھیلوں میں تقریباً ایک لاکھ دراہم بھیجے؛ لیکن شام ہوتے ہوتے اس طرح انھیں تقسیم کردیا کہ ایک درہم بھی نہیں بچ سکا کہ جس سے اس دن کے افطار کانظم ہو پاتا“۔

رسول اکرم ﷺ کی زوجیت میں

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی قسمت کا ستارہ اس وقت اوج ثریّا پر پہنچ گیا جب وہ دنیا کے سب سے پاکباز انسان، محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہوئیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے پہلا نکاح حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا سے ہوا تھا، بہ وقت نکاح آپ کی عمر پچیس اور حضرت خدیجہ کی چالیس برس تھی، حضرت خدیجہؓ نہایت غم گسار اوراطاعت شعار بیوی تھیں، ہجرت سے تین سال قبل نبوت کے دسویں سال حضرت خدیجہ کی وفات سے آپ کو بڑا رنج ہوا، جاں نثار صحابہ نے اس کیفیت کو محسوس کرکے آپ کو نکاحِ ثانی کا مشورہ دیا؛ چنانچہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت خولہ بنت حکیم نے آپ کے پاس آکر عرض کیا کہ آپ دوسرا نکاح کرلیں،

آپ نے فرمایا: کس سے؟ خولہ نے کہا: بیوہ اور کنواری دونوں طرح کی لڑکیاں موجود ہیں، جس کو پسند فرمائیں اس کے متعلق گفتگو کی جائے، فرمایا: وہ کون ہیں؟ خولہ رضی اللہ عنہا نے کہا: بیوہ تو سودہ بنت زمعہ ہیں اور کنواری ابوبکر کی لڑکی عائشہ، ارشاد ہوا: بہتر ہے تم اس کی نسبت گفتگو کرو۔

حضرت خولہ رضی اللہ عنہا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی پا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر آئیں اور ان سے تذکرہ کیا۔ جاہلیت کا دستور تھا کہ جس طرح سگے بھائیوں کی اولاد سے نکاح جائز نہیں، عرب اپنے منہ بولے بھائیوں کی اولاد سے بھی شادی نہیں کرتے تھے، اس بناء پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: عائشہ تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھتیجی ہے، آپ سے نکاح کیوں کر ہوسکتا ہے؟ حضرت خولہ نے آکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا، آپ نے فرمایا: ابوبکر میرے دینی بھائی ہیں اور اس قسم کے بھائیوں کی اولاد سے نکاح جائز ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جب یہ معلوم ہوا تھا تو انھوں نے قبول کرلیا۔

لیکن اس سے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جبیر بن مطعم کے بیٹے سے منسوب ہوچکی تھیں؛ اس لیے ان سے بھی پوچھنا ضروری تھا، حضرت ابوبکر نے جبیر سے جا کر پوچھا کہ تم نے عائشہ کی نسبت اپنے بیٹے سے کی تھی، اب کیا کہتے ہو؟ جبیر نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ جبیر کا خاندان ابھی اسلام سے آشنا نہیں ہوا تھا، اس کی بیوی نے کہا: اگر یہ لڑکی ہمارے گھر آگئی تو ہمارا بچہ بددین ہوجائے گا ہم کو یہ بات منظور نہیں۔ (مسند احمد، ۶/۲۱۱، سیرت عائشہ ص ۲۴)

حدیثوں میں آیا ہے کہ نکاح سے پہلے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ ایک فرشتہ ریشم کے کپڑے میں لپیٹ کر آپ کے سامنے کوئی چیز پیش کررہا ہے، پوچھا کیا ہے؟ جواب دیا کہ آپ کی بیوی ہیں۔ آپ نے کھول کر دیکھا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ عن عائشة قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اريتك في المنام مرتين، اذا رجل يحملك في سرقة حرير، فيقول: هذه امرأتك، فاكشفها، فإذا هي أنتِ، فأقول: أن يكن هذا من عند الله يمضه. (صحیح بخاری، ۵۰۷۸)

بہ وقت نکاح اور رخصتی حضرت عائشہ کی عمر

مشہور اور محقق قول یہی ہے کہ بہ وقت نکاح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر چھ سال کی تھی اور بہ وقت رخصتی نو سال کی تھی۔ (بخاری، باب تزویج النبی عائشۃ وقدومہا المدینۃ وبنائہا بہا، ۳۸۹۴)

اگرچہ بعض حضرات نے اس قول کی تغلیط کی ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بہ وقت

نکاح سولہ سال اور بہ وقت رخصتی اٹھارہ سال کی تھیں، ہمارے دیار میں اس قول کے قائلین میں سرفہرست مولانا محمد علی اور مولانا حبیب الرحمٰن کاندھلوی صاحبان ہیں، مؤخرالذکر کا اس موضوع پر ''تحقیق عمر صدیقۂ کائنات'' کے نام سے مستقل رسالہ ہے؛ لیکن یہ قول غیر محقق اور ناقابل اعتنا ہے: اس کی متعدد وجوہ ہیں

(۱) صحیحین کی احادیث اس بات پر متفق ہیں کہ بہ وقت رخصتی حضرت عائشہ نو سال کی تھیں۔

(۲) حضرت عائشہؓ نے خود ہی اپنی شادی کا واقعہ نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "إنا زفت إليه وهي بنت تسع سنين ولعبها معها، ومات عنها وهي بنت ثمان عشرة" (صحیح مسلم، حدیث: ۱۴۲۲)

اور ظاہر ہے کہ خود صاحب واقعہ کی تصریح کو محض کمزور بنیادوں پر رد کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے اور حضرت عائشہ جیسی قوت حفظ وفہم میں ممتاز راویہ کا خود اپنی عمر کے متعلق ایسی غلطی ہونا کہ اپنی گیارہ برس کی عمر کو چھ برس کی اور سولہ برس کی عمر کو نو برس کی اور اپنی پچیس برس کی بیوگی کو اٹھارہ برس کی عمر کی بیوگی کہہ دے، عجوبۂ روزگار ہے۔

(۳) جو حضرات اٹھارہ سال کے قائل ہیں ان کے بہ قول حضرت عائشہ کی پیدائش چار سال قبل بعثت ہوتی ہے؛ حالاں کہ یہ قول محققین کی تصریح کے بالکل خلاف ہے؛ چنانچہ ذہبی کہتے ہیں: "عائشة ممن ولدت في الإسلام" اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "وولدت – يعني عائشة – بعد المبعث بأربع سنين أو خمس سنين" (الاصابة)

(۴) کتب سیرت میں وضاحت ہے کہ حضرت عائشہ کا انتقال ۵۷ھ میں بہ عمر تریسٹھ سال ہوا ہے اور یہ اس وقت درست ہوگا؛ جب کہ بہ وقت ہجرت حضرت عائشہ کی عمر ۸ سال تسلیم کی جائے۔

(۵) ہشام پر طعن کرنے کے بجائے مسئلے پر اس پہلو سے غور کریں کہ حضرت عائشہ جس وقت رخصت ہوکر میکے لائی جاتی ہیں تو وہ جھولے پر سے اور کھیل سے اٹھا کر لائی جاتی ہیں، ان کی ماں ان کا منھ دھوتی ہیں، بال برابر کردیتی ہیں، چھوٹی سہیلیاں ساتھ ہوتی ہیں، یہاں آکر بھی گڑیوں کے کھیلنے کا شوق باقی رہتا ہے اور تمام واقعات واحادیث میں بالتفصیل مذکور ہیں، سوال یہ ہے کہ آیا یہ ایک نو برس کی کم سن لڑکی کا حلیہ ہے یا سولہ برس کی پوری جوان عورت کا؟ (دیکھو: مسند طیالسی، ص ۲۰۵، اور دارمی، ص ۲۹۲، سیرت عائشہ، ص ۳۱۹)

بہ ہر حال دلائل سے یہ بات متحقق ہے کہ بہ وقت نکاح حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال اور بہ وقت رخصتی ۹ سال تھی۔

مستشرقین کا اعتراض

اس پر مستشرقین اور متجددین کو سخت اعتراض ہے کہ ایک نو سالہ لڑکی کیسے کسی مرد کے قابل ہوسکتی ہے؟ اور وہ بھی جن کی عمر پچاس سے متجاوز ہو؟

نکاح بہ امر الٰہی تھا

اس کا سیدھا اور آسان جواب یہ ہے کہ یہ نکاح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ امر الٰہی فرمایا تھا... جیسا کہ روایت میں تصریح گزر چکی ہے کہ خواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نکاح کی بابت بتلا دیا گیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ارشاد فرمایا تھا: "إن یکن من عند اللّٰہ یمضہ".

لیکن ظاہر ہے کہ آج کی مادہ پرست، دین بیزار دنیا کو اس جواب سے قناعت اور تسلی نہیں ہوسکتی، تو آیئے ہم اس کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھتے ہیں:

اس عمر میں نکاح کا رواج تھا

دراصل نکاح ایک معاشرتی عمل ہے؛ بلکہ معاشرتی ضرورت ہے؛ اس لیے نکاح میں ہر جگہ کے معاشرے، وہاں کی تہذیب اور عرف وعادت کو بڑا دخل ہوتا ہے، اس تناظر میں ہمیں نظر آتا ہے کہ حضرت عائشہؓ جس معاشرے کا حصہ ہیں، اس میں کم سنی میں نکاح قطعاً معیوب نہیں؛ بلکہ متعارف اور رائج ہے؛ چنانچہ:

(۱) حضرت قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی نومولود لڑکی سے اسی دن نکاح پڑھا دیا جس دن وہ پیدا ہوئی۔ (مرقاۃ ۳/۴۱۷)

(۲) خود آنحضرت ﷺ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے کم سن لڑکے سلم کا نکاح حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نابالغ لڑکی سے کیا تھا۔ (احکام القرآن رازی، ج۲، ص۵۵) بلکہ ترکمانی فرماتے ہیں: "وزوج غیر واحد من الصحابۃ ابنتہ الصغیرۃ" (ترکمانی علی البیہقی، ج۱، ص۷۶-۷۹)

بلکہ نو، دس سال کی عمر اس زمانے اور اس معاشرے میں وہ عمر تھی جس میں میاں بیوی کے تعلقات قائم ہوسکتے تھے؛ چنانچہ بخاری شریف میں حسن ابن صالح کا قول نقل کیا گیا ہے "أدرکت جارۃً لنا جدۃً بنت احدی وعشرین سنۃ" (باب بلوغ الصبیان وشہادتہم، کتاب الشہادات) (ہمارے پڑوس میں ایک خاتون تھیں جو اکیس سال کی عمر میں دادی بن گئی تھیں) یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس جدہ کا نکاح صغرسنی میں ہوا تھا اور صرف دس سال کی عمر میں اس نے بچہ جنا تھا اور یہی صورت حال اس کی بیٹی کی بھی رہی۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ انھوں نے بھی ایک خاتون کو دیکھا ہے جو نو سال کی عمر میں بالغ ہوگئی تھی اور دس سال کی عمر میں اس کے یہاں بیٹی کا تولد ہوا (دیکھیے فتح الباری، ج ۵، ص ۳۱۲) اس لیے فقہاء نے بھی رخصتی اور زفاف کے لیے کسی خاص عمر کی تحدید نہیں کی ہے؛ بلکہ اس کا مدار اس کی طاقت اور جسمانی ساخت پر ہے؛ چنانچہ ہدایہ میں ہے: "أكثر المشائخ على أنه لا عدة للسن في هذا الباب، وإنما العدة للطاقة إن كانت ضخمة سميته تطبيق الرجال ولا يخاف عليها الرمض من ذلك، كان للزوج أن يدخل بها وإن لم تبلغ تسع سنين" (اکثر مشائخ کی رائے یہ ہے کہ اس باب (صغیرہ سے جماع) میں عمر کا کوئی اعتبار نہیں ہے؛ بلکہ اعتبار طاقت وقوت کا ہے، اگر بھاری بھرکم اور موٹی ہو مردوں کو برداشت کرلیتی ہو اور اس کے سبب مرض کا اندیشہ نہ ہو تو شوہر دخول کرسکتا ہے اگرچہ وہ نو سال کی بھی نہ ہو)۔

اور خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح میں بھی یہ اہم حقیقت ملحوظ ہے؛ چنانچہ ان کا عقد اگرچہ چھ سال کی عمر میں ہوگیا تھا؛ لیکن رخصتی کے لیے مزید تین سال انتظار کیا گیا اور اس دوران ان کی والدہ اِس کا خاص خیال رکھتی تھیں اور مختلف غذاؤں کے ذریعے اس کی تدبیر کرتی تھیں کہ جسم کسی قدر فربہ ہوجائے، چنانچہ حضرت عائشہؓ خود فرماتی ہیں: "أرادت أمي ان تسمنني لدخولي على رسول الله صلى الله عليه وسلم فلم أقبل عليها بشيء مما تريد حتى اطعمتنى القثاء بالرطب، فسمنت عليه كأحسن السمن" (رواہ ابوداوٗد وابن ماجہ)

اس لیے اس عرب معاشرے کو ہمارے اس معاشرے پر قیاس کرنا فضول ہے جس میں کمسن لڑکیوں سے نکاح معاشرتی جرم سمجھا جاتا ہے۔

عرب معاشرے میں آج بھی یہ قابل قبول ہے

بلکہ آج بھی عرب معاشرہ اس کو قبول کیے ہوئے ہے؛ چنانچہ العربیۃ نیٹ نے یکم نومبر ۲۰۱۰ء کو ایک رپورٹ شائع کی تھی جس کا عنوان ہی تھا: "صغيرات يفضلن كبار السن والمتزوجين" (کم عمر لڑکیاں معمر اور شادی شدہ مردوں کو ترجیح دے رہی ہیں) اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ذہنی سکون اور مالی منفعت کی خاطر بہت سی عرب لڑکیاں کبیر السن مردوں کو ترجیح دیتی ہیں، مثال کے طور پر ایک سولہ سالہ طالبہ کہہ رہی ہے کہ اسے اس پر اطمینان اور مسرت ہے کہ اس کا نکاح ایک چھیاسٹھ سالہ مرد سے ہونے جارہا ہے، ۲۰ سالہ ''حنان'' کا کہنا ہے کہ اس کی پانچ بہنیں ہیں اور پانچوں کا نکاح شادی شدہ مردوں سے ہوا ہے اور وہ پانچوں آسودگی اور عافیت کی زندگی گزار رہی ہیں۔ (دیکھیے

العربیہ ڈاٹ نیٹ)

اس لیے اس کی سخت ضرورت ہے کہ نکاح چوں کہ ایک معاشرتی عمل ہے؛ اس لیے اس کے مختلف پہلوؤں میں اس سماج و معاشرہ کے عرف و رواج کا خاص خیال رکھا جائے۔

چنانچہ روایت سے ثابت ہے کہ حضرت عائشہ سے نکاح کا مشورہ سب سے پہلے ایک قریشی خاتون حضرت خولہ بنت حکیم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا، اگر کمسنی کا نکاح معاشرتی اعتبار سے معیوب ہوتا تو یقیناً وہ خاتون کبھی نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا مشورہ دیتیں اور نہ ہی حضرت عائشہ کی والدہ ام رومان کبھی اس کے لیے آمادہ ہوتیں اور کفار مخالفین کو بھی ایک موقع ہاتھ آجاتا اور آپ کی شخصیت کو داغدار کرنے اور آپ کے خلاف پروپیگنڈے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے؛ لیکن سب کو معلوم ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا؛ بلکہ حضرت عائشہؓ اس سے پہلے ہی جبیر بن مطعم کے بیٹے سے منسوب ہوچکی تھیں، بیٹے کی ماں کی طرف سے رشتے کا انکار کیے جانے کے بعد ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ منظور کیا تھا۔

گرم آب و ہوا

دوسری اہم بات یہ ہے کہ کمسنی کے نکاح کو معاشرتی طور پر قبول عام حاصل ہونے میں وہاں کی گرم آب و ہوا کو بھی بڑا دخل ہے، جس کے نتیجہ میں لڑکیاں جلد مردوں کے قابل ہوجایا کرتی ہیں، خاص کر ایسی لڑکیاں جن میں ذہنی نشو ونما کی صلاحیت ہوتی ہے قامت اور جسم کے اعتبار سے بھی وہ جلد بڑھتی ہیں۔ حضرت علامہ سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں: ''اس کم سنی کی شادی کا اصل منشا نبوت اور خلافت کے درمیان تعلقات کی مضبوطی تھی، ایک تو خود عرب کی آب و ہوا میں عورتوں کی غیر معمولی نشو نما کی طبعی صلاحیت موجود ہے، دوسرے عام طور پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جس طرح ممتاز اشخاص کے دماغی اور ذہنی قوی میں ترقی کی غیر معمولی استعداد ہوتی ہے، اسی طرح قد و قامت میں بھی بالیدگی کی خاص قابلیت ہوتی ہے، بہر حال اس کم سنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنی زوجیت میں قبول کرنا، اس بات کی صریح دلیل ہے کہ لڑکپن ہی سے ان میں نشو ونما، ذکاوت، جودت ذہن اور نکتہ رسی کے آثار نمایاں تھے۔'' (سیرت عائشہ ص ۲۵)

حضرت عائشہ کا تأثر

اس مسئلہ پر اس پہلو سے بھی غور کیا جاسکتا ہے کہ خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس نکاح کو کس نگاہ سے دیکھتی ہیں، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کبھی اس نکاح پر ناگواری کا

اظہار تو کیا، وہ اس کو اپنی بہت بڑی خوش بختی سمجھتی تھیں، ان کا ایقان تھا کہ وہ دنیا کی سب سے خوش قسمت بیوی ہیں اور کیوں نہ ہو جب کہ شوہر دنیا کے سب سے بہترین انسان، رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ملے تھے، اس کے ساتھ ہی وہ اپنی اس شادی کو انتہائی مبارک خیال کرتی تھیں اور آپ کی شادی اور رخصتی دونوں شوال میں ہوئی؛ اس لیے آپ شوال ہی کے مہینہ میں اس قسم کی تقریبوں کو پسند کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ ''میری شادی اور رخصتی دونوں شوال میں ہوئی اور بایں ہمہ شوہر کے حضور میں مجھ سے خوش قسمت کون تھیں'' (صحیح بخاری و مسلم کتاب النکاح)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت وفرمانبرداری اور آپ کی مسرت کے حصول میں شب وروز کوشاں رہتیں، اگر ذرا بھی آپ کے چہرے پر حزن وملال کا اثر نظر آتا، بے قرار ہو جاتیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کا اتنا خیال تھا کہ ان کی کوئی بات ٹالتی نہ تھیں، ایک دفعہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے خفا ہوکر ان سے نہ ملنے کی قسم کھا بیٹھی تھیں؛ لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ننیہالی لوگوں نے سفارش کی تو انکار کرتے نہ بنا، آپ کے دوستوں کی بھی اتنی ہی عزت کرتی تھیں اور ان کی کوئی بات بھی رد نہیں کرتی تھیں۔

علم کی اشاعت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کم سنی میں نکاح کی متعدد مصلحتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا نصف حصہ جو عام نگاہوں سے اوجھل تھا وہ امت کے سامنے آ گیا اور علم ومعرفت کے اعتبار سے مسلمانوں کو زبردست نفع پہنچا، علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں: ''عرب میں خود مردوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا تو عورتوں میں کیا ہوتا، جب اسلام آیا تو قریش کے سارے قبیلہ میں صرف سترہ آدمی لکھ پڑھ سکتے تھے، ان میں شفاء بنت عبداللہ عدویہ صرف ایک عورت تھیں، اسلام کی دنیوی برکتوں میں یہ واقعہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ نوشت وخواند کا فن بھی فروغ پاتا جاتا تھا، بدر کے قیدیوں میں جو نادار تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا فدیہ یہ مقرر کیا تھا کہ وہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، صفہ میں کم وبیش سو اصحاب داخل تھے ان کو دیگر تعلیمات کے ساتھ لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا۔

ازواج مطہرات میں حضرت حفصہ رضی اجللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا لکھنا پڑھنا جانتی تھیں، حضرت حفصہ نے خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یہ فن شفاء بنت عبداللہ عدویہ سے سیکھا تھا بعض اور صحابیات بھی نوشت وخواند سے آشنا تھیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کثرت ازواج اور خصوصاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس کم سنی کی شادی میں بڑی مصلحت یہ تھی کہ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دائمی فیضان صحبت نے سیکڑوں مردوں کو سعادت کے درجہ اعلیٰ پر پہنچا دیا تھا؛ لیکن فطرۃً یہ موقع عام عورتوں کو میسر نہیں آسکتا تھا، صرف ازواج مطہرات اس فیض سے متمتع ہوسکتی تھیں اور پھر یہ نور آہستہ آہستہ انھیں ستاروں کے ذریعے سے پوری کائنات نسوانی میں پھیل سکتا تھا۔

حضرت عائشہ کے علاوہ دوسری ازواج مطہرات بیوہ ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حبالۂ عقد میں داخل ہوئی تھیں، اس بنا پر ان میں حضرت عائشہ ہی خالص فیضان نبوت سے مستفیض تھیں، لڑکپن کا زمانہ جو عین تعلیم وتربیت کا زمانہ ہے، ابھی شروع ہوا ہی تھا کہ کاشانۂ نبوت میں پہنچادی گئیں کہ ان کی ذات اقدس، پُرنور اور کامل بن کر دنیا کی نصف آبادی کے لیے شمع راہ بن جائے۔ (سیرت عائشہ ص ۳۱)

چنانچہ علمی حیثیت سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نہ صرف عام عورتوں پر، نہ صرف امہات المومنین پر، نہ صرف خاص خاص صحابیوں پر؛ بلکہ چند بزرگوں کو چھوڑ کر تمام صحابہ رضی اللہ علیہم پر فوقیت عام حاصل تھی، صحیح ترمذی میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ”ما أشكل علينا أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم حديث قط فسألنا عائشة إلا وجدنا عند ها منه علما“ (ہم صحابیوں کو کوئی ایسی مشکل بات کبھی نہیں پیش آئی کہ جس کو ہم نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا ہو اور ان کے پاس اس کے متعلق کچھ اہم معلومات ہم کو نہ ملی ہوں) عطا بن ابی الرباح تابعی رحمۃ اللہ علیہ جن کو متعدد صحابہ سے تلمذ کا شرف حاصل تھا، کہتے ہیں: ”كانت عائشة أفقه الناس وأعلم الناس وأحسن رأيا في العامة“ (حضرت عائشہ سب سے زیادہ فقیہ، سب سے زیادہ صاحب علم اور عوام میں سب سے زیادہ اچھی رائے والی تھیں)۔

حفظ حدیث اور سنن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اشاعت کا فرض گو دیگر ازواج مطہرات بھی ادا کرتی تھیں؛ تاہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رتبہ کو ان میں سے کوئی بھی نہیں پہنچی، محمود بن لبید کا بیان ہے کہ ازواج مطہرات، بہت سی حدیثیں زبانی یاد رکھا کرتی تھیں؛ لیکن حضرت عائشہ اور ام سلمہ کے برابر نہیں، امام زہری کی شہادت ہے: ”لو جمع علم الناس كلهم وعلم أزواج النبي صلى الله عليه وسلم فكانت عائشة أوسعهم علمًا“ (اگر تمام مردوں کا اور امہات المومنین کا علم ایک جگہ جمع کیا جاتا، تو حضرت عائشہ کا علم ان میں سب سے وسیع ہوتا) بعض محدثین نے

حضرت عائشہؓ کے فضائل میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خذوا شطر دینکم عن حمیراء" (اپنے مذہب کا ایک حصہ حُمیرا سے سیکھو) اس حدیث کو ابن اثیر "نہایہ" میں اور فردوس اپنی مسند میں (بتغیر الفاظ) لائے ہیں؛ لیکن لفظاً اس کی سند ثابت نہیں اور اس کا شمار موضوعات میں ہے؛ تاہم معناً اس کے صحیح ہونے میں کس کو شک ہے۔ (سیرت عائشہ ص ۱۴۷)

کم سنی میں نکاح مسیحیت اور یہودیت کی نگاہ میں

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اس نکاح کے متعلق سب سے زیادہ شکوک وشبہات مستشرقین اور عالم نصرانیت نے پیدا کیے ہیں؛ حالاں کہ اگر ہم نصرانیت کی اندرون خانہ تلاشی لیں تو یہ حقیقت واشگاف ہوجاتی ہے کہ مسیحی مصادر، مثلاً انسائیکلوپیڈیا آف کیتھولوجیک کے مطابق حضرت مریم کا نکاح جس وقت یوسف نجار سے ہوا، اس وقت ان کی عمر صرف بارہ سال اور یوسف نجار کی عمر نوے سال سے متجاوز تھی) دیکھے (www.newadvent.org)

ظاہر ہے یہ محض افسانہ ہے جس کا ہمارے نقطۂ نظر کے اعتبار سے حقائق سے کوئی واسطہ نہیں؛ لیکن اس سے اتنا تو ثابت ہے کہ عیسائی چرچ اس کم سنی کو زوجین کی عمر میں اس قدر واضح فرق کے باوجود نکاح کے مناسب خیال کررہا ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اس عمر کی شادی اس وقت کی ثقافت تھی جو صرف عربوں میں نہیں؛ بلکہ عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔

اسی طرح یہودی، بڑی تعداد میں مدینہ منورہ میں رہتے تھے، وہ بھی آپ پر لعن طعن کے مواقع کی تاک میں رہتے تھے؛ لیکن کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ اس نکاح پر یہودیوں نے کبھی بھی تنقید کی ہو، یہ صاف اور صریح دلیل ہے کہ اس طرح کا نکاح اس وقت کے یہودی معاشرے میں بھی قابل قبول تھا۔

یورپی معاشرے میں کم سنی کے نکاح کا تصور

اسی طرح واشنگٹن پوسٹ میں سارہ بوڈمین کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں وہ مان رہی ہیں کہ اس دور میں بھی مغربی دنیا میں نوسال کی عمر میں جنسی تعلقات قائم ہوجاتے ہیں۔ (دیکھیے: واشنگٹن پوسٹ، ۱۰؍مئی ۲۰۰۶ء)

اسی طرح بی بی سی کی سائٹ پر ایک رپورٹ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اسپین سے تعلق رکھنے والی ایک کم سن بچی نے اپنا پہلا بچہ محض دس سال کی عمر میں جنم دیا ہے اور اس کا خاندان اس پر بے انتہا مسرور ہے؛ بلکہ اس کی دادی کو بلاوجہ اس واقعہ کو میڈیا میں اہمیت دیے جانے پر سخت تعجب ہے؛

کیوں کہ اس معاشرہ کے لیے عام سی بات ہے۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ عقلاً یا عرفاً کسی بھی طرح یہ نکاح ایسا نہیں ہے کہ جس پر واویلا مچایا جائے، اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ شریعت کم سنی میں نکاح کی دعوت دے رہی ہے؛ بلکہ ہماری گفتگو کا حاصل ہے کہ اگر خاص مصالح کے پیش نظر طرفین کی رضامندی سے اس طرح کے نکاح کی نوبت آتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہوا:

(۱) بہ وقت رخصتی حضرت عائشہؓ کی عمر کے سلسلے میں دو روایتیں ہیں: لیکن اٹھارہ سال والا قول روایت اور درایت دونوں اعتبار سے غلط ہے اور نو سال کی عمر والا قول ہی صحیح اور معتبر ہے، محض اس بنا پر اس قول کی تغلیط درست نہیں ہے کہ اسے ماننے کی صورت میں معاندین کا اشکال لازم آتا ہے؛ اس لیے کہ اس عمر میں نکاح پر کسی قسم کی معذرت یا اظہار ندامت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس سے پہلے جبیر بن مطعم کے بیٹے سے منسوب ہو چکی تھیں اور ایک خاتون یعنی حضرت خولہ بنت حکیم نے سب سے پہلے آپ کو اس نکاح کا مشورہ دیا تھا، یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس وقت کے معاشرے میں زواج کے لیے یہ معروف طبعی عمر تھی اور اس عمر میں نکاح کو معیوب بالکل نہیں سمجھا جاتا تھا۔

(۳) عرب کا معاشرہ ایسا ہے کہ جس میں گرم آب و ہوا کی وجہ سے نشو و نما جس تیزی سے ہوتی ہے؛ وہ ہمارے یا کسی اور معاشرے سے بہت حد تک مختلف ہے۔

(۴) اس وقت بھی مغربی ممالک میں اس عمر میں جنسی تعلقات قائم ہو کر توالد و تناسل کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا اور آج بھی بعض عرب معاشرے میں شادی شدہ، کبیر السن شوہروں سے نکاح کو افضل خیال کیا جاتا ہے۔

(۵) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کم سنی میں نکاح سے متعدد دینی تعلیمی اور تربیتی مصلحتیں وابستہ تھیں اور علم نبوت کا ایک اہم حصہ ان کے ذریعے امت تک پہنچ سکا۔

(۶) مسیحیت کے بنیادی ماخذ میں یہ مذکور ہے کہ حضرت مریم کا نکاح یوسف نجار سے اس وقت ہوا تھا جب کہ وہ بارہ سال کی اور یوسف نجار نوے سال سے زیادہ کی عمر کے تھے، نیز یہود مدینہ جو قابل اعتراض امور کی تاک میں رہتے تھے، انھوں نے بھی کبھی اس حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر انگلی نہیں اٹھائی، جو اس امر کی صریح دلیل ہے کہ عیسائی اور یہودی معاشرے میں بھی یہ قابل

قبول عمل تھا۔

(۷) آخری بات یہ ہے کہ خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس نکاح سے حد درجہ مطمئن ہیں، زوجین میں ایسا توافق اور مثالی محبت ہے جس کی نظیر بہت کم ملتی ہے، ایسا ہرگز نہیں کہ کبھی بھی ان کے کسی عمل سے اس نکاح پر ناراضگی یا خفگی محسوس ہوئی ہو؛ بلکہ وہ تو اپنی خوش قسمتی پر حد درجہ نازاں تھیں؛ حالاں کہ ایک موقع ایسا بھی آیا جب انھیں خود خالق کائنات کی طرف سے اختیار دیا گیا کہ چاہے تو وہ اس نکاح میں ہی رہیں اور اگر چاہیں تو طلاق لے لیں، دنیا کی بہاریں ان کی منتظر ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدائی فرمان کو پیش کرنے سے پہلے احتیاطاً یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تم جواب دینے سے پہلے اپنے والدین سے مشورہ کرلینا؛ لیکن انھوں نے فوراً کہہ دیا: کیا میں آپ کے سلسلے میں اپنے والدین سے مشورہ کروں گی؟ مجھے اللہ اور اس کے رسول ہی پسند ہیں۔ تو محبت واعتماد کی مضبوط بنیادوں پر قائم ایسے پاکیزہ نکاح کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا اور طعن وتنقید کا نشانہ بنانا، حق وانصاف کا گلا گھوٹنا نہیں تو اور کیا ہے؟

اللہ پاک ہم سب کو فہمِ صحیح عطا کریں اور صراطِ مستقیم پر گامزن رکھیں؛ آمین، وصلی اللہ علی النبی الکریم محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔



میراث میں عورتوں اور یتیم پوتوں کا حصہ

(موجودہ اشکالات کے تناظر میں)

بہ قلم: ڈاکٹر مولانا اشتیاق احمد قاسمی
مدرس دارالعلوم دیوبند

عنوان دو اجزاء پر مشتمل ہے: پہلا جز عورتوں کی میراث پر ہونے والے اعتراضات اوران کے جواب، دوسرا جز یتیم پوتوں کو دادا کا ترکہ نہ ملنے پر ہونے والے اعتراضات اوران سب کے جواب!

آیئے! پہلے عورتوں کی میراث اوراُن پر ہونے والے اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں، فرانس کا ایک مستشرق ہے، جس کا نام (Gaston wiet) گیسٹن ویٹ ہے، اس نے لکھا ہے کہ ''اسلام میں عورتوں کو ذلیل وحقیر رکھا گیا ہے؛ یہاں تک کہ میراث میں بھی اس کا حصہ مرد سے آدھا ہے۔'' (مفتریات ص ۳۸، مؤلفہ: محمد عبداللہ السمان بحوالہ: تکبیر مسلسل مارچ ۲۰۱۷ء)

جواب: (۱) اس اعتراض کا تجزیہ کیجیے کہ کیا یہ الزام درست ہے؟ کیا ساری عورتوں کو اسلام نے مردوں کے مقابلے میں آدھا دیا ہے، یا چند عورتوں کو؟

ظاہر ہے کہ ساری عورتوں کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہے، جیسا کہ کتاب وسنت کے ''ابواب الفرائض'' میں تفصیل موجود ہے اور چند عورتوں کو لے کر اعتراض ہے تو اتنا بڑا پروپیگنڈہ کیوں؟ پورے اسلام کو بدنام کیوں کیا جارہا ہے؟ اگر غور کیجیے تو معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آئے گا، وہ یہ کہ ''اسلام نے مردوں سے دوگنا عورتوں کو دیا'' ہے، میراث کی سب سے مشہور کتاب اٹھایئے، اس میں ''اصحاب فرائض'' کو دیکھیے یعنی ان لوگوں کو جن کا ترکہ قرآن وسنت میں مذکور ہے، وہ کل بارہ افراد ہیں؛ جن میں آٹھ عورتیں ہیں اور مرد صرف چار ہیں، عورتوں میں (۱) بیوی، (۲) بیٹی، (۳) پوتی، (۴) حقیقی بہن، (۵) علاتی بہن، (۶) اخیافی بہن، (۷) ماں، (۸) دادی ہے اور مردوں میں (۱) باپ، (۲) دادا، (۳) اخیافی بھائی، (۴) شوہر ہے۔

گویا اسلام نے عورتوں کی زیادہ تعداد کو ترکہ دیا ہے، یعنی حصہ پانے والی عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں دوگنی ہے۔

یہاں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مردوں کو اگر دوگنا دیا گیا ہے تو یہ اس وجہ سے معقول ہے کہ ان کی تعداد عورتوں کے مقابلے میں آدھی ہے تو دوگنا ملنا ہی چاہیے، تبھی تو دونوں صنفوں میں برابری ہوگی! اب یہ کہنا کہ عورتوں کو اسلام نے ذلیل رکھا ہے بالکل غلط ہوگا؛ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اسلام نے عدل کیا ہے عورتوں کو عزت دی ہے، دوسرے مذاہب میں عورتوں کو ترکہ سے بالکل محروم رکھا گیا ہے۔

غیر اسلامی قوانین و مذاہب میں میراث

اگر کوئی اسلام پر اعتراض کرتا ہے تو اُسے اسلام سے اچھا کوئی آسمانی یا انسانی قانون یا مذہب کے طور پر مانا ہوا قانون پیش کرنا چاہیے، جس میں اسلامی قانون کی طرح پورے بسط وتفصیل کے ساتھ میراث کا قانون موجود ہو، مذاہب عالم کو اسلام سے حقیقت میں کوئی تقابل نہیں؛ اس لیے کہ وہ یا تو انسانوں کے بنائے ہوے ہیں، یا ان میں اتنی تبدیلی ہوئی ہے کہ ان کا آسمانی ہونا مشکل ہے اور الٰہی قانون کہنا کسی طرح درست نہیں؛ لیکن ان کے ماننے والے دنیا میں ہیں تو کیا کوئی میراث کے اسلامی قانون کی طرح کوئی تفصیلی قانون دکھا سکتا ہے؟ جو اسلام سے بہتر ہو! ہرگز نہیں، سو بار ہرگز نہیں!

عورتوں کے میراث کے پہلو کو لیجیے! تو معلوم ہوگا کہ روے زمین کے تقریباً سارے قوانین و مذاہب میں عورتوں کو میراث سے محروم رکھا گیا ہے، مثال کے طور پر ذیل میں چند مذاہب کا جائزہ لیتے ہیں:

(الف) ''یونانی قانون'' میں ترکہ صرف لڑکوں کو دیا گیا تھا، اس کی دلیل یہ تھی کہ خاندانی مسائل وحالات کی نگرانی لڑکا ہی کرتا ہے، گھریلو حقوق وفرائض وہی ادا کرتا ہے؛ اس لیے اسی کو ترکہ ملے گا۔ لڑکیوں کے اندر یہ صلاحیت نہیں اور ان کی یہ ذمہ داری نہیں ہے؛ اس لیے لڑکیوں کو ترکہ نہیں ملے گا۔ (احکام المیراث ص ۷۵ مؤلفہ ڈاکٹر محمد محمد براج بحوالہ تکبیر مسلسل مارچ ۲۰۱۷ء)

(ب) ''بابلی قانون'' میں بھی لڑکیوں کو اس صورت میں ترکہ نہیں دیا جاتا تھا جب کہ میت کا لڑکا یا بھائی موجود ہوتا تھا، اگر دونوں موجود نہ ہوتے تو لڑکیوں کو ترکہ ملتا تھا۔ (الاعجاز لنظام المیراث، مؤلفہ احمد یوسف سلیمان)

(ج) ''یہودی مذہب'' میں میت کی لڑکی کو اسی وقت ترکہ ملتا تھا جب کہ میت کا کوئی لڑکا موجود

نہ ہوتا۔ اسی طرح یہ بھی شرط تھی کہ لڑکی کو اسی وقت ترکہ ملے گا جب کہ وہ اپنے قبیلے اور خاندان میں بیاہی جائے، اگر خاندان سے باہر شادی ہوتی تھی تو اس کو ترکہ نہیں ملتا تھا، یہودی مذہب میں بیوی کو بھی ترکہ نہیں دیا جاتا تھا اور بیوی کی کمائی اور اس کے ترکے کا مستحق اس کا شوہر ہوتا تھا۔ (تورات: کتاب گنتی باب ۲۱، ۲۷، باب ۳۶)

(د) ''عیسائی مذہب'' میں عورتوں کو ناپاک مخلوق مانا جاتا تھا، ان کے یہاں الگ سے کوئی قانونِ میراث نہیں ملتا؛ مگر عیسیٰ علیہ السلام چوں کہ بنی اسرائیل کے خاتم الانبیاء ہیں اور تورات کے بدلے ہوئے احکام کو درست کرنے کے لیے تشریف لائے تھے؛ اس لیے مستقل احکامات انجیل میں نہیں ملتے، بالفرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ عیسائیوں کے یہاں بھی اصولی طور پر توارت کا حکم ہی مسلّم ہے۔ یعنی ان کے یہاں بھی لڑکوں اور چچاؤں کی موجودگی میں لڑکیوں کو نہ دیا جانا مسلّم تھا۔

(نوٹ) یہاں ایک سوال ہوگا کہ اگر یہودی اور عیسائی اپنے مذہب کے آسمانی اور الٰہی ہونے کا دعویٰ کریں تو کیا یہ مانا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لڑکیوں کو لڑکوں اور چچاؤں کی موجودگی میں محروم فرمایا ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چوں کہ تورات وانجیل میں تحریفیں ہوتی رہی ہیں؛ اس لیے یہ حکم بھی انھیں تحریفات میں سے ہوسکتا ہے؛ اور یہ کہ اس لیے بھی قرینِ قیاس ہے کہ میراث کے احکامات قرآن مجید میں بڑے اہم اور سخت ہیں، میراث پر عمل نہ کرنے والا فاسق اور زبان سے انکار کرنے والا اور میراث کے قرآنی احکامات کو نہ ماننے والا کافر ہے؛ اس لیے اس کے لیے ہمیشہ ہمیش جہنم میں رکھے جانے کی وعید آئی ہے۔ (نساء: ۱۴) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تورات وغیرہ میں یہ حکم قرآن کی طرح ہوگا؛ مگر لوگوں نے اس میں تحریف کی ہوگی۔

(ھ) ''ہندو مذہب'' میں بھی میراث میں عورتوں کا کوئی حق نہ تھا، منوسمرتی (۱۰۴/۹) میں لکھا ہے کہ ''ماں باپ کی ساری دولت بڑا بیٹا لے، چھوٹا اور منجھلا بھائی بڑے بھائی سے اوقات گزاری کریں، جس طرح والدین سے پرورش پاتے تھے۔'' (مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ ص ۱۶۱)

یجروید، اتھروید وغیرہ کا خلاصہ یہ تھا:

۱- عورت اور شودر دونوں نردھن (مال سے محروم) ہیں۔

۲- لڑکی باپ کی جائیداد کی وارث نہیں ہے۔

۳- اگر کسی بیوہ کو اپنے شوہر کی طرف سے کوئی جائیداد ملی ہوئی ہے تو وہ اُسے بیچ نہیں سکتی۔

۴- لڑکا نہ ہو تب بھی لڑکی وارث نہیں ہوسکتی؛ البتہ متبنّیٰ یعنی لے پالک وارث ہوگا۔

(مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ ص ۱۲۸)

ہندوستان کے قانون میں ۲۰۰۵ء میں ہندوعورت کو یہ حق دیا گیا کہ باپ کی مشترکہ جائیداد میں لڑکی کا حصہ بھی لڑکے کے برابر ہوگا۔ (تکبیر مسلسل مارچ ۲۰۱۷ء)

(و) ''عرب'' میں زمانہ جاہلیت میں عورتوں کو ترکہ نہ دینے کا رواج تھا، اسی پر سارے عرب عمل کرتے تھے، ان کے یہاں ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' تھی، وہ کہتے تھے:

كَيْفَ نُعْطِي الْمَالَ؟ مَنْ لا يَرْكَبُ فَرَسًا وَلَا يَحْمِلُ سَيْفًا وَلَا يُقَاتِلُ عَدُوًّا (المواریث ص ۲۱)

ترجمہ: ہم (اس صنف کو) مال کیسے دیں؟ جو نہ گھوڑے پر سوار ہوتی ہے، نہ تلوار اٹھاتی ہے اور نہ دشمن سے جان توڑ مقابلہ کرتی ہے!

زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے یہاں عورتوں اور بچوں کو کوئی مال نہ دیا جاتا تھا، نہ ترکہ اور نہ مال غنیمت وغیرہ؛ بلکہ عورتیں مردوں کی دست نگر اور محتاج ہوتی تھیں، ان کا کھانا، خرچہ، کپڑا اور رہائش مرد برداشت کرتے تھے؛ اس لیے ترکہ بھی نہ دیتے تھے۔ اسلام نے عورتوں کو انصاف دیا، جہاں اُن کو زندہ درگور ہونے سے بچایا، وہیں گھر کی ملکہ بنا کر ترکہ اور میراث میں ان کا حصہ مقرر کیا، اُن کو کسی کا محتاج نہ چھوڑا۔

اوپر متعدد مشہور مذاہب میں وراثت کے قانون کا جائزہ لیا گیا، ان کو دوبارہ پڑھیں، اندازہ ہوجائے گا کہ عورتوں کو ترکہ اور میراث سے محروم رکھنے میں سب کے سب متفق ہیں، سب ہم آواز ہیں نہ تو یونانی اور بابلی قوانین میں عورتوں کو ترکہ دیا گیا ہے، نہ یہودیت وعیسائیت میں اور نہ ہی ہندو مذہب اور عربی مذہب میں اس کمزور صنف کی اَشک شوئی کی گئی ہے۔

یہاں سوال ہوتا ہے کہ جب دیگر مذاہب میں عورتوں کو بالکل دیا ہی نہیں گیا ہے تو ان پر اعتراض کیوں نہیں ہوتا، اسلام اُن سے بہرحال بہتر ہے کہ دیا تو ہے چاہے آدھا ہی سہی! اس کے جواب سے پہلے ہمارے یہاں کی مثل سنیے: ''غریب کی بیوی سب کی بھوجائی'' (بھابی) یعنی غریب کی بیوی سے سب مذاق کرتے ہیں، آج اسلام غریب ہے؛ اس لیے مذاق بنا ہوا ہے۔

صرف اور صرف اسلامی قانون میں عورتوں کو عدل کے پیمانے سے تول تول کر ترکہ دیا گیا ہے، اسلام میں عدل ہے، جس کی مثال کسی دوسرے قانون میں کہیں بھی موجود نہیں۔

جواب (۲): اسلام پر اعتراض تھا کہ عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں آدھا ترکہ دیا گیا ہے،

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ پورے قانون میں ذوی الفروض کا اگر جائزہ لیا جائے تو صرف تین جگہ ایسا ملے گا اور وہ اس وقت جب کہ مذکر ومؤنث دونوں ایک ہی درجے میں ہوں۔

۱- جب بھائی بہن کے ساتھ وارث ہوں، اس کی چار شکلیں بنیں گی:

(الف) جب میت کے بیٹے بیٹی وارث ہوں

(ب) جب میت کے پوتے پوتی وارث ہوں

(ج) جب میت کے حقیقی بھائی بہن وارث ہوں

(د) جب میت کے علاتی بھائی بہن وارث ہوں

۲- جب میاں بیوی ایک دوسرے کے وارث ہوں تو اولاد ہونے کی صورت میں شوہر کو ربع (چوتھائی) اور بیوی کو ثمن (آٹھواں) ملتا ہے اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں شوہر کو نصف (آدھا) اور بیوی کو رُبع (چوتھائی) ملتا ہے، ان میں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ شوہر کو بیوی کا دوگنا دیا گیا ہے۔

۳- جب ماں اور باپ وارث ہوں اور دوسرا کوئی نہ ہو تو ماں کو ایک تہائی اور باپ کو دو تہائی ترکہ عصبہ ہونے کی وجہ سے ملتا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں مذکر کو دوگنا دیا گیا ہے، وہ بھی باریک حکمتوں کے پیش نظر حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ ''حجۃ اللہ البالغۃ'' (۳۷۴/۲) میں لکھتے ہیں:

أنَّ الذكَرَ يُفَضَّلُ على الأنثٰى إذا كانا في منزلة واحدة أبدًا؛ لاختصاص الذكور بحماية البيضة والذب عن الذمار؛ ولأنَّ الرجالَ عليهم إنفاقاتٌ كثيرةٌ فهم أحق بما يكون شبه المجان بخلاف النساء فإنَّهُنَّ كَلٌّ على أزواجهن أو آبائهِنَّ أو أبنائِهِنَّ. وهو قوله تعالىٰ: الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُواْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ (نساء: ۳۴)

ترجمہ: مرد کو عورت پر (ترکہ میں) صرف اسی صورت میں ہمیشہ ترجیح دی گئی ہے جب کہ دونوں ایک درجے میں ہوں، (گویا اوپر کی ساری شکلیں اس میں آگئیں) وطن کی حمایت اور اپنوں کے دفاع میں مرد کے خاص ہونے کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ مردوں پر بہت سے اخراجات لازم ہیں؛ اس لیے مفت کی طرح ملنے والے مال کے زیادہ حق دار ہیں، برخلاف عورتوں کے؛ اس لیے کہ وہ (بلا نکاح) اپنے باپ دادا، بیٹے پوتے اور (نکاح کے بعد) اپنے شوہروں پر بوجھ ہوتی ہیں اور یہ (باتیں) اللہ تعالیٰ کے قول (میں) ہیں: مرد عورتوں پر نگراں ہیں، اس فوقیت کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ

نے ایک کودوسرے پر دی ہے اوراس وجہ سے کہ وہ اپنا مال (ان کی کفالت میں) خرچ کرتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہاں ''ایک'' بات تو یہ بیان فرمائی کہ مردوں کو عورتوں سے دوگنا صرف اس صورت میں ملتا ہے جب کہ دونوں ایک ہی درجے کے ہوں، یہ بات اوپر کی تینوں صورتوں میں خوب واضح ہے کہ ماں باپ، میاں بیوی اور بھائی بہن سب ایک درجہ میں ہیں۔

''دوسری'' بات یہ فرمائی کہ ترکہ میں مردوں کو دووجہ سے زیادہ ملتا ہے ایک تو اس وجہ سے کہ مرد مردانگی کے کام کرتا ہے، اپنے اہل وعیال کی حفاظت میں شیر دل ہوکر بیٹھا رہتا ہے، عزت، آبرو اور جان ومال کی حفاظت کے لیے لڑنے کی نوبت آتی ہے تو لڑتا بھی ہے، اس میں شاہ صاحب نے دیگر مذاہب اور عرب کے قیاسی استدلال کو ملحوظ رکھا اور دوسری بات یہ بیان فرمائی کہ عورت پر مرد خرچ کرتا ہے، گویا ''آمدنی بقدر خرچ'' کے اصول پر عمل کرتے ہوئے مردوں کو دوگنا دیا گیا کہ وہ بیوی بچے، ماں باپ اور خود اپنے اوپر خرچ کرتا ہے، اولاد کی تعلیم وتربیت اوران کی بیاہ شادی پر خرچ کرتا ہے، بیوی کا مہر دیتا ہے، کھانا، کپڑا اور رہائش کا انتظام کرتا ہے، آنے والے مہمانوں کی ضیافت کرتا ہے، صدقہ خیرات کرتا ہے، گھر کے لوگوں کے دوا علاج پر خرچ کرتا ہے، کبھی کوئی جرمانہ کسی پر عائد ہوا تو اس کی ادائیگی کرتا ہے۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

والحكمةُ أنَّ الرجال تلحقهم مُؤَنٌ كثيرةٌ بالقيام بالعِيَالِ وَالضِّيفان والأرقّاء والقاصدين ومؤاسات السائلين وتَحَمُّلِ الغرامات وغير ذلك. (شرح صحيح مسلم)

ترجمہ: (مردوں کو میراث زیادہ دینے کی) حکمت یہ ہے کہ مردوں پر بہت سی مالی ذمہ داریاں آپڑتی ہیں، اہل وعیال، مہمان، غلام، آنے جانے والے کی ذمہ داری، مانگنے والوں کی دل جوئی اور تاوان کا بوجھ وغیرہ۔

رہی عورت تو اس کا اسلام میں کوئی خرچہ نہیں، شادی سے پہلے اور شادی نہ ہو تو پوری زندگی وہ باپ کے پاس رہتی اور باپ اس کی کفالت کرتا ہے، باپ پر کفالت واجب ہے اور شادی کے بعد شوہر پر شریعت نے نفقہ واجب کیا ہے اور اگر باپ نہیں ہے تو بیٹے پھر بھائی پھر چچا پر نفقہ واجب ہے؛ بلکہ محتاج ہونے کی صورت میں محرم رشتے دار پر بقدر میراث نفقہ واجب رہتا ہے اور وارث کو اس پر مجبور کیا جائے گا۔

والنفقة لكل ذي رحم محرم؛ إذا كان صغيرًا فقيرًا أو كانت امرأة بالغة فقيرة أو كان ذكرًا بالغًا فقيرًا زَمِنًا أو أعمٰى. (هدايه ۱۹۲/۲ مكتبه بُشرى كراچى) ويجب على

مقدار الميراث ويجبر عليه. (ايضًا).

ترجمہ: ہرمحرم رشتے دار کا خرچہ اس وقت واجب ہے جب کہ وہ نابالغ اور محتاج ہو یا عورت محتاج بالغ ہو یا بالغ محتاج اپاہج یا اندھا ہو اور نفقہ (بالفرض) وراثت پانے کی مقدار کے مطابق واجب ہوتا ہے اور اس (کی ادائیگی) پر رشتے دار کو مجبور کیا جائے گا۔

غور کرنے کا مقام

یہاں سوچنا چاہیے کہ عورت کو اسلام نے ایک طرف تو ترکہ میں حصہ دیا ہے، دوسری طرف مردوں پر اس کا خرچہ واجب ہے تو دونوں طرف سے تو اسی کو ملا اور کسی کا خرچہ اس کے ذمہ واجب نہیں ہے تو اس کا تو سب بچا ہی رہ جائے گا، میراث کے ساتھ زندگی بھر کا خرچہ مل جاتا ہے؛ اس لیے وہ بڑے مزے میں رہتی ہیں اور مسلمان عورتوں کا پرس کبھی خالی نہیں رہتا۔

ایک تجربہ

عورتوں کا پیسہ بچا رہتا ہے اور مرد کا خرچہ ہوتا رہتا ہے، اس کا ایک تجربہ ناچیز کو حیدرآباد دکن میں ہوا، بیس سال پہلے جب میں وہاں ''دارالعلوم'' میں مدرس تھا، تنخواہ ساڑھے تین ہزار تھی، اپنی عادت کے مطابق تنخواہ ملتے ہی اہلیہ کو دوسو روپے دے دیتا تھا؛ تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرلے اور بقیہ سے دوسری ساری ضرورتیں پوری ہوتی تھیں، اتفاق سے ایک دن ایک مہمان آگئے مہینے کا آخری عشرہ چل رہا تھا، ضیافت کا انتظام نہیں تھا، قرض لیتے ہوئے شرم آرہی تھی، اہلیہ نے میری پریشانی کو محسوس کیا، اس نے کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں میرے پاس پیسے ہیں، میں نے کہا: تمہارے پاس کہاں سے؟ اس نے کہا کہ آپ جو ہر مہینے دیتے ہیں وہ میرے پاس موجود ہے، پورا گھر تو آپ کی جیب سے چلتا ہے، میرا پیسہ کہاں خرچ ہوگا؟ اس پر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور کہا کہ قرض کے طور پر دے دو؛ تاکہ ضیافت ہوجائے اور تنخواہ ملنے کے بعد یاد سے لے لینا۔ اب اطمینان ہوا اور مہمان کی ضیافت قدرے اچھے انداز میں ہوگئی۔

اس واقعہ میں غور کیجیے کہ گھر کے ذمہ دار مرد کے پاس تین ہزار روپے ہیں وہ خرچ ہوگئے اور عورت کے پاس صرف دوسو روپے ہیں وہ جمع ہیں اور کئی مہینوں کے جمع ہیں، تو اگر اسلام نے عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں آدھا دیا تو وہ بھی بہت ہے۔

شیخ صابونی کی ایک مؤثر مثال

جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ کے استاذ تفسیر وفرائض شیخ محمد علی صابونیؒ نے فرائض کے موضوع پر

ایک لاجواب کتاب لکھی ہے،اس کا نام ہے، "المواريث في ضوء الكتاب والسنة" اس کتاب میں انھوں نے لکھا ہے کہ فرض کرو کہ ایک آدمی کا انتقال ہوا،اس کے ورثاء میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے،ترکہ تین ہزار ریال ہے،لڑکے کو دو ہزار اور لڑکی کو ایک ہزار ملے،اتفاق سے لڑکے کی شادی ہوئی اس کی بیوی کا مہر دو ہزار ہے تو اس نے پورے دے دیے اور اس کا ہاتھ خالی ہوگیا ابھی اس کے ذمے بیوی کا نان ونفقہ لباس اور رہائش کا انتظام باقی ہے،ادھر لڑکی کی شادی ہوئی اس کو اپنے شوہر سے مہر مثلاً دو ہزار ملے،اس طرح اس کے پاس تین ہزار ریال جمع ہوگئے،اس کا خرچہ نہ پہلے تھا اور نہ بعد میں ہے؛ بلکہ کھانا،خرچہ،لباس و پوشاک اور رہائش کا انتظام سب کچھ اس کے شوہر کے ذمے ہے۔

اب اندازہ کیجیے کہ اسلام میں ترکہ کی تقسیم عقل وانصاف کے مطابق ہے یا عقل وانصاف کے خلاف؟

اعتراض کرنے والے جہاں عورتوں پر ظلم کی باتیں کرتے ہیں، وہیں اپنے ظلم کو اگر دیکھیں تو ان کی آنکھیں کھل جائیں گی، انھوں نے عورتوں کو بکاؤ مال بنا رکھا ہے، دکانوں، ہوٹلوں اور قحبہ خانوں میں ان کی عزتیں نیلام ہورہی ہیں، اُن کو اخراجات کا انتظام کرنے کا مکلّف بنایا جارہا ہے، حد یہ ہے کہ ان کے معاشرے میں بیوی اپنا کما کر خود کھاتی ہے شوہر اپنا کما کر کھاتا ہے، دونوں اپنی رہائش وآسائش کا انتظام خود کرتے ہیں؛ اس لیے ان کو اسلام پر اعتراض ہوتا ہے، وہ ایک آنکھ سے اسلامی احکام کو دیکھ کر اعتراض کرتے ہیں، اگر دونوں آنکھیں کھول کر اسلام کے سارے قوانین کا مطالعہ کریں تو ان کے دل کی آنکھیں بھی کھل جائیں!

اصل بات یہ ہے کہ اسلام نے عورت ہونے کی بنیاد پر بعض صورتوں میں فرق نہیں کیا ہے؛ بلکہ مالی ذمہ داریوں کا خیال کیا ہے، جس کی مالی ذمہ داری زیادہ ہے اس کو زیادہ دیا ہے، اس کی تعبیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "الخراج بالضمان" سے فرمائی ہے۔ (ترمذی ۱۲۸۵) اس کا مطلب یہ ہے کہ جو نقصان برداشت کرتا ہے فائدہ بھی اسی کو ملتا ہے۔ اس کی دوسری تعبیر "الغُنُمُ بالغرم" بھی ہے، (الاشباہ والنظائر)۔

جواب (۳) یہ الزام ہے کہ اسلام نے عورتوں کو مردوں سے آدھا دیا ہے، درست نہیں؛ اس لیے کہ بہت سی صورتیں ایسی ہیں جن میں عورتوں کو مردوں سے زیادہ دیا گیا ہے:

۱- اگر کسی عورت کا انتقال ہوجائے اور اس کے ورثاء میں شوہر، ماں باپ اور دو بیٹیاں ہوں اور ترکہ سو روپے ہوں تو شوہر کو بیس، ماں اور باپ میں سے ہر ایک کو تیرہ روپے تینتیس پیسے اور دونوں

بیٹیوں کو مشترکہ طور پر ترپن روپے تینتیس پیسے ملیں گے؛ لیکن اگر دو بیٹی کی جگہ دو بیٹے ہوں تو بیٹے کو مشترکہ طور پر صرف اکتالیس روپے چھیاسٹھ پیسے ملیں گے اور باپ اور ماں میں سے ہر ایک کو سولہ روپے چھیاسٹھ پیسے ملیں گے اور شوہر کو پچیس روپے ملیں گے۔ تو دیکھیے کہ اس صورت میں بیٹی کی جگہ اگر بیٹا ہو تو بیٹی کا حصہ زیادہ اور بیٹے کا حصہ کم ہے۔ تو یہ کہنا درست نہیں کہ اسلام نے بیٹے کو زیادہ دیا ہے اور بیٹی کو کم۔

۲- مذکورہ بالا مثال میں اگر بیٹی ایک ہو اور ترکہ سو روپے ہوں تو بیٹی کو چھیالیس روپے پندرہ پیسے ملیں گے اور ایک بیٹا ہو تو اسے اکتالیس روپے چھیاسٹ پیسے ملیں گے۔ یہاں بھی لڑکے کو کم اور لڑکی کو زیادہ مل رہا ہے۔ اس صورت میں شوہر کو پچیس روپے اور ماں اور باپ میں سے ہر ایک کو سولہ روپے چھیاسٹھ پیسے ملیں گے۔

۳- اگر ورثاء میں شوہر، ماں اور دو حقیقی بہنیں ہوں اور ترکہ سو روپے ہو تو شوہر کو سینتیس روپے پچاس پیسے ملیں گے، ماں کو بارہ روپے اٹھائیس پیسے اور دونوں بہنوں کو پچاس روپے ملیں گے۔

اگر دو حقیقی بہنوں کی جگہ دو حقیقی بھائی ہوں تو حقیقی بھائی کو صرف تینتیس روپے تینتیس پیسے ملیں گے اور شوہر کو پچاس روپے اور ماں کو سولہ روپے چھیاسٹھ پیسے ملیں گے۔

۴- اگر کسی کا انتقال ہو جائے اور وہ شوہر، ماں اور حقیقی بہن چھوڑے اور ترکہ سو روپے ہوں تو شوہر کو بیالیس روپے پچاسی پیسے، ماں کو چودہ روپے اٹھائیس پیسے اور بہن کو بیالیس روپے پچاسی پیسے ملیں گے اور اگر اس صورت میں بہن کی جگہ ایک حقیقی بھائی ہو تو بھائی کو تینتیس روپے تینتیس پیسے ملیں گے اندازہ لگائیں کہ بہن کو بھائی کے مقابلے میں کتنا زیادہ مل رہا ہے۔ یہی اسلام کی نوازش ہے؛ اس لیے یہ اعتراض بے جا ہے کہ اسلام میں عورتوں پر ظلم ہوا ہے۔

۵- بعض صورتوں میں عورت کا حصہ مرد سے کافی بڑھ جاتا ہے، مثال کے طور پر ایک آدمی نے اپنی بیوی، ماں، دو حقیقی بھائی اور دو اخیافی بہن چھوڑی اور ترکہ سو روپے ہیں تو بیوی کو پچیس روپے، ماں کو سولہ روپے اور حقیقی بھائی کو پچیس روپے اور اخیافی بہن کو تینتیس روپے تینتیس پیسے ملیں گے؛ لیکن اگر کسی عورت کا انتقال ہوا اور وہ شوہر کے ساتھ دو حقیقی بھائی اور دو علاتی بہنوں کو چھوڑے تو ترکہ شوہر کو پچاس روپے اور دونوں حقیقی بھائیوں کو سولہ روپے چھیاسٹھ پیسے اور دونوں علاتی بہنوں کو تینتیس روپے تینتیس پیسے ملیں گے۔ یہاں دیکھیے کہ دونوں صورتوں میں عورت کو مرد سے زیادہ ترکہ مل رہا ہے، تو کس منہ سے کہا جائے کہ اسلام نے عورت کو کم دیا ہے؟

۶- اگر کسی نے اپنے شوہر، ماں، اخیافی بہن اور دو حقیقی بھائی کو چھوڑا اور ترکہ سو روپے ہیں تو شوہر کو پچاس، ماں کو سولہ روپے چھیاسٹھ پیسے، تنہا اخیافی بہن کو سولہ روپے چھیاسٹھ پیسے اور دونوں حقیقی بھائیوں کو مشترکہ طور پر سولہ روپے چھیاسٹھ پیسے ملیں گے تو یہاں دیکھیے کہ عورت کو اس کے برابر والے مرد کے مقابلے میں دوگنا مل رہا ہے۔ یہاں تو معاملہ بالکل الٹا ہو گیا کہ مرد کو عورت کے مقابلے میں آدھا ملا، تو کیا اعتراض کرنے والے اندھے ہیں؟ یا اللہ نے انھیں اندھا کر دیا ہے کہ نظر نہیں آ رہا ہے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کرگیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی تھا

عورت وارث ہوتی ہے مرد نہیں

بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ ان میں عورت وارث ہوتی ہے اور اگر اس کی جگہ اسی کا ہم رتبہ مرد ہو تو وہ وارث نہیں ہوتا، مثال کے طور پر ایک عورت کا انتقال ہوا، اس نے اپنے شوہر، باپ، ماں، بیٹی کے ساتھ پوتی کو چھوڑا تو پوتی وارث ہوگی اس کو چھٹا حصہ ملے گا؛ لیکن اگر اس کی جگہ پوتا ہو تو وہ عصبہ قریب باپ کی وجہ سے محروم ہو جائے گا۔

جن صورتوں میں عورتوں کو مردوں کے برابر حصہ ملتا ہے

۱- اگر کسی نے اپنے ورثاء میں ماں، باپ اور دو لڑکے چھوڑے تو ماں اور باپ دونوں کو الگ الگ چھٹا حصہ ملے گا اور بیٹا عصبہ ہوگا۔

مسئلہ چھ سے بنے گا باپ کو ایک، ماں کو ایک اور لڑکے کو چار ملیں گے۔

اس صورت میں اگر لڑکے کی جگہ میں دو لڑکی ہو تو اس کو دو تہائی ملے گا، یعنی چھ میں سے چار ملیں گے، گویا اس صورت میں اگر لڑکا ہو تو یا لڑکی ہو تو دونوں کو چھ میں سے چار ملیں گے، دونوں برابر ہوں گے۔

۲- ماں شریک بھائی اور بہن دونوں کو برابر حصہ ملتا ہے، یہاں مرد عورت برابر کے مستحق ہیں۔ اس کی صراحت قرآن کریم میں ہے۔

۳- اگر کوئی آدمی صرف بیٹا چھوڑے تو سارا ترکہ بیٹا کو ملے گا، تو اگر وہ صرف بیٹی کو چھوڑے تو بھی سارا ترکہ بیٹی کو ملے گا، مطلب یہ کہ تنہا ہونے کی صورت میں بیٹا ہو یا بیٹی دونوں برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں۔

۴- اگر کوئی عورت شوہر اور حقیقی بھائی کو چھوڑے تو دونوں کے درمیان ترکہ آدھا آدھا تقسیم ہوگا شوہر ذوالفرض ہونے کی حیثیت سے آدھا لے گا اور بھائی عصبہ ہونے کی وجہ سے بچا ہوا آدھا لے گا۔

اگراس صورت میں بھائی کے بجائے ایک بہن ہوتو وہ بھی ذوالفرض ہونے کی حیثیت سے شوہر کے ساتھ آدھا ترکہ لے گی۔ گویا اس صورت میں عورت ہوتو بھی یا مرد ہوتو بھی دونوں کو برابر ملے گا۔

۵-مرنے والا اگرکوئی ماں باپ کے ساتھ ایک لڑکا چھوڑے تو ماں اور باپ دونوں کو برابر یعنی سدس ملے گا۔

جواب (۴): یہ الزام کہ اسلام نے عورتوں کو مردوں سے کم دیا ہے؛ اس لیے بھی درست نہیں کہ قرآنِ پاک میں حصے کل چھ ہیں: ثلثان، (دوتہائی) نصف (آدھا) ثلث (تہائی) ربع (چوتھائی) سدس (چھٹا) ثمن (آٹھواں)۔

(الف) ان سب میں سب سے بڑا حصہ ثلثان (دوتہائی) ہے، اس کو لینے والیاں صرف عورتیں ہیں، یعنی متعدد بیٹی، پوتی، حقیقی بہن اور علاتی بہن، کسی مرد کو یہ بڑا والا حصہ نہیں ملتا۔ اس سے بھی خوب واضح ہوگیا کہ اسلام نے عورتوں کو زیادہ دیا ہے۔

(ب) اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ ان حصوں کو لینے والے ورثا رکل تیئس (۲۳) ہیں، ان میں سترہ عورتیں اور چھ مرد ہیں، اس سے بھی اندازہ لگایئے کہ اسلام نے عورتوں کو زیادہ دیے ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ثلثان کو لینے والیاں تو اوپر ذکر کی گئیں، نصف بھی وہی چار لیتی ہیں اور ساتھ ہی شوہر کو بھی ملتا ہے۔ ثلث ماں، ماں شریک بھائی، ماں شریک بہن کو ملتا ہے۔ کل بارہ ہوگئے، ربع میاں بیوی کو ملتا ہے، سدس آٹھ لوگوں کو ملتا ہے یعنی ماں، دادی، پوتی، علاتی بہن، اخیافی بہن، اخیافی بھائی اور باپ دادا۔ اور آٹھواں صرف بیوی کو ملتا ہے کل تیئس افراد ہوئے۔ دیکھیے مرد صرف چھ جگہ نظر آئیں گے۔ تو اسے عورت پر ظلم کس طرح کہا جاسکتا ہے؟ یہ تو عورتوں پر اسلام کے نوازشات ہیں۔

اسلام کو چھوڑ کر رواج کو اپنانا

جب متحدہ ہندوستان پر اسلامی حکومت تھی تو وراثت کی تقسیم کے لیے اسلامی قانون رائج تھا اور مغلیہ حکومت تک اس پر عمل ہوتا چلا آرہا تھا؛ مگر جب انگریزوں کا غلبہ ہوگیا اور وہ پورے ہندوستان پر قابض ہوگئے تو انھوں نے مسلمانوں سے ایک سوال کیا کہ آپ لوگ قرآن وسنت کے مطابق ترکہ تقسیم کرنا چاہتے ہیں یا رواج کے مطابق؟ دونوں میں فرق یہ تھا کہ اسلامی قانون میں عورتوں کو ترکہ ملتا ہے جب کہ رواج نہ دینے کا ہے تو کیا آپ لوگ لڑکیوں کو دینا چاہتے ہیں یا نہیں؟

تو اس کا جواب ہندوستان کے کئی اضلاع سے یہ آیا کہ ہم لوگ رواج مطابق ترکہ تقسیم کرنا چاہتے ہیں، عورتوں کو دینا نہیں چاہتے، (مفید الوارثین ص۳۲) یہ کتنا افسوس ناک جواب تھا، اس کو

وہی آدمی سمجھ سکتا ہے جس کے دل میں اللہ کے قانون کی عظمت ہے، جو قرآن وسنت پر ایمان ویقین رکھتا ہے، جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت سے محبت اور عشق ہے۔

یہ مشرکانہ جواب ان زمینداروں کا تھا جو دنیا کی محبت میں قرآن مجید کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے تھے اور آخرت پر کامل یقین نہیں رکھتے تھے، ان کو معلوم نہیں تھا کہ زبان سے ترکہ کا انکار کرنا گناہ کبیرہ ہے اور عملاً نہ دینا فسق ہے اور قرآن کے حکم کو حکم نہ سمجھنا کفر ہے جس کی سزا دائمی جہنم ہے۔ ان کا جواب ان عرب جاہلوں کے جواب کی طرح تھا جو لڑکیوں کو زندہ دفن کرتے، یتیموں کا مال کھاتے اور میت کا بڑا لڑکا، یا بھائی یا چچا وغیرہ مال پر قبضہ کر لیتا تھا۔ مالوں پر قبضہ باقی رکھنے کے لیے یتیم لڑکیوں کا نکاح نہیں کرتے تھے۔

میراث غصب کرنے کے لیے بہنوں کی تقسیم کا حیلہ

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں عورتوں کو ترکہ سے محروم رکھنے کے لیے بھائی آپس میں بہنوں کی تقسیم کر لیتے ہیں، ہمارے بہار میں بھی یہ حیلہ چل رہا ہے، مثال کے طور پر دو بھائیوں کی چار بہنیں ہیں تو دونوں بھائی دو دو بہن کو اپنے حصے میں تقسیم کر کے لے لیتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ سب جب بھی میکے آئیں گی تو ان کی ضیافت متعلق بھائی کرے گا، واپسی کے وقت کپڑے اور دیگر ہدیے تحفے وہی دے گا اور ترکہ میں بہنوں کو حصہ نہیں دے گا، متعلقہ بہن ترکہ مانگ نہیں سکتی، اگر اس نے کبھی بھی ترکہ مانگا تو سارے لوگ اُسے اُلاہنا دیں گے اور بھائی قطع رحمی کی دھمکی دے گا کہ اگر تعلق باقی رکھنا ہے، آنے جانے کا سلسلہ قائم رکھنا ہے تو ترکہ نہیں ملے گا، اگر لے گی تو تیرے لیے میکے کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

یہاں غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ رشتہ داریاں اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی نعمت ہیں، انھیں کوئی کاٹ نہیں سکتا؛ انسان کے کاٹنے سے اللہ کا جوڑا ہوا رشتہ نہیں کٹتا ہے، اگر کوئی قطع تعلق کرے تو یہ گناہ کبیرہ ہوگا اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ عمل سزا کا سزاوار ہے۔

اس لیے بھائیوں کو ہدیہ تحفہ کی لالچ اور قطع تعلق کی دھمکی دے کر بہنوں کی میراث غصب کرنا جائز نہیں، یہ گناہِ کبیرہ ہے، اللہ کی تقسیم کو زمین پر قائم کرنا ہم لوگوں کا فریضہ ہے میراث کو خود اللہ تعالیٰ نے تقسیم فرمایا ہے؛ اس لیے ہمیں کسی طرح اس کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے! ایسا کرنا عرب کے جاہلوں جیسا عمل ہے جو اپنے قریبی رشتہ دار کی عورتوں کو اپنے پاس میراث کے طور پر رکھ لیتے تھے، قرآن پاک میں صاف فرمایا گیا:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا يَحِلُّ لَكُمۡ أَن تَرِثُواْ ٱلنِّسَآءَ كَرۡهٗا (نساء:۱۹)

ترجمہ: اے مؤمنو! تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ تم عورتوں کو مجبور کر کے وارث بن جاؤ۔

عرب اپنے قریبی رشتہ دار کی وفات کے بعد عورتوں کو اپنے قابو میں کر لیتے تھے اور ان کے ساتھ چار طرح کا سلوک کرتے تھے۔

۱- یا تو ان سے بلا مہر نکاح کر لیتے تھے، اگر نکاح کا رشتہ جائز ہوتا تھا، یا ان کو مہر نہیں دیتے تھے۔

۲- یا کسی سے ان کا نکاح کرا دیتے اور مہر پر خود قبضہ جما لیتے تھے۔

۳- یا ان کو نکاح سے روکے رہتے تھے اور جب وہ اپنا سارا ترکہ اس کو دے دیتیں تو نکاح کی اجازت دیتے تھے۔

۴- یا ان کو موت تک اپنے پاس ہی رکھے رہتے اور مرنے کے بعد اُن کے مالوں پر قبضہ کر لیتے تھے۔ (جلالین)

اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر ظلم ہونے کی وجہ سے خصوصی طور پر آیتیں نازل فرمائیں؛ تاکہ ان کو اُن کا حق مل جائے اور مرد اپنا ترکہ اپنے حق سے زیادہ محض لاٹھی کے زور سے لے لیتے تھے؛ اس لیے ان کے لیے بھی قانون بنا دیا؛ تاکہ زیادہ نہ لیں؛ لیکن نزولِ آیت کا اصل مقصد عورتوں کو حق دلانا تھا۔

عورت کو انصاف دینے کے لیے آیت میراث کا نزول

حضرت سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تھا، وہ شہید ہو گئے تھے ان کی بیوی، دولڑکیاں زندہ تھیں، بھائی نے ترکہ پر قبضہ کر لیا، اب بیوی بہت پریشان ہوئیں، دونوں بچیوں کے گزر بسر اور شادی بیاہ کا مسئلہ سامنے تھا؛ چنانچہ ان کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچیں اور پورا قصہ سنایا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ارجعي فَلَعَلَّ اللّٰهَ سَيَقضِي فيه" ابھی واپس جاؤ اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ جلد ہی اللہ تعالیٰ اس سلسلے میں فیصلہ فرمائیں؛ چنانچہ کچھ دنوں بعد وہ پھر دوبارہ واپس آئیں اور رونے لگیں، ان کی آہ آسمانوں کو پار کر کے عرش تک پہنچ گئی اور آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیم بچیوں کے چچا کو بلایا اور حکم فرمایا کہ مرحوم کی دونوں بچیوں کو دو تہائی اور بیوہ کو آٹھواں حصہ دے دو اور جو بچے وہ تیرا ہے۔ یہ میراث کی پہلی آیت ہے جو ایک مظلوم عورت کی دادرسی اور فریادرسی کے لیے نازل ہوئی۔ (تفسیر کبیر نساء: ۱۱)

عورتوں کی میراث سے عرب میں ہلچل

جب آیت میراث نازل ہوئی اور عورتوں کو ترکے کا مستحق قرار دیا گیا تو عرب میں اس کا چرچا ہونے لگا انھیں ایسا لگ رہا تھا کہ شاید یہ حکم غلط ہے، رسول اللہ ﷺ سے بھول ہو گئی ہے، لوگوں نے

ایک دوسرے سے کہنا شروع کیا کہ ابھی اس حکم کو عام نہ کرو ہوسکتا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کریں کہ یارسول اللہ! ہم لڑکی کو باپ کے ترکے میں سے آدھا کس طرح دیں گے؛ جب کہ وہ گھوڑے پر سوار نہیں ہوتی ہے، نہ دشمن سے لڑتی ہے اور کیا ہم میراث میں بچوں کو بھی حصہ دیں؟ جب کہ وہ ہمیں کچھ کام نہیں آتے؛ چنانچہ ان لوگوں نے اپنی تسلّی کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا؛ مگر چوں کہ یہ حکم قطعی اور لازمی تھا؛ اس لیے ان کی ایک نہ سنی گئی۔ (طبری ۷/۲۳)

میراث کا حکم جبری ہے

میراث کی تقسیم اللہ تعالیٰ نے خود فرمائی ہے؛ اس لیے فقہائے کرام کا اتفاق ہے کہ یہ حکم جبری اور ضروری ہے، کسی کے ساقط کرنے سے ساقط نہیں ہوتا، علامہ شامی لکھتے ہیں:

الإرثُ جَبْرِيٌّ لا يَسْقُطُ بالإسقاط. (کتاب الدعویٰ ۷/۵۰۵، ایچ، ایم سعید)

ترجمہ: میراث (کا حکم) جبری ہے کسی کے ساقط کرنے سے ساقط نہیں ہوتا۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی تاکید فرمائی ہے اور اس کے لیے ''وصیت'' کی تعبیر اختیار فرمائی ہے جس کے معنی ہیں ''بڑا تاکیدی حکم'' پھر آگے ارشاد فرمایا کہ تم اپنے باپ دادا اور بیٹے پوتے کے بارے میں نہیں جانتے کہ ان میں سے کون تمھیں زیادہ فائدہ پہنچائے گا (نساء: ۱۱) مقصد یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی تقسیم کو بلا کسی غور وفکر کے مان لو، اسی میں خیر پوشیدہ ہے۔ پھر آگے فرمایا کہ ترکہ کی تعیین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ (بندوں کے احوال) خوب جانتے ہیں اور باریک گہری سوجھ بوجھ والے وہی ہیں۔ (نساء: ۱۱) اس لیے اُن پر ایمان لاکر حکم کو فوراً مان لو، اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ آگے ارشاد فرمایا کہ یہ اللہ کے حدود ہیں اور جو اللہ اور اس کے پیغمبر کی بات مانے گا تو اُسے ایسے باغوں میں داخل فرمائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔ (نساء: ۱۳) اس کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے تصویر کے دوسرے رخ کو بھی واضح فرمادیا کہ جو اللہ اور اس کے پیغمبر کی بات نہیں مانے گا اور اللہ کے حدود (کھینچی ہوئی لکیروں) سے آگے بڑھے گا اُسے اللہ تعالیٰ آگ میں ڈالیں گے وہ اس میں سدا رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہے (نساء: ۱۴)

مذکورہ بالا آیتوں کو بار بار پڑھیے اور اندازہ کیجیے کہ میراث کا حکم کتنا سخت ہے کہ اس کی مخالفت دائرۂ اسلام سے نکال دیتی ہے اور ہمیشہ کے لیے جہنم میں ڈال دیتی ہے۔

حدیث میں وعید: حدیث شریف میں ہے، حضرت انسؓ سے روایت ہے:

مَنْ قَطَعَ مِيْرَاثَ وَارِثِهٖ قَطَعَ اللّٰهُ مِيْرَاثَهٗ مِنَ الجنّةِ يوم القيامةِ. (مشکوۃ المصابیح ۱/۲۶۶ باب الوصایا)

ترجمہ: جو آدمی اپنے (ساتھ والے) وارث کی میراث کو کاٹ لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جنت سے اس کی میراث کو کاٹ دیں گے یعنی جہنم میں بھیج دیں گے۔

یتیم پوتوں کی میراث

اب عنوان کے دوسرے جز پر گفتگو شروع کرتے ہیں، یعنی ''یتیم پوتوں کی میراث'' یتیم کا لفظ آتے ہی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اسی کے ساتھ محتاج و نادار ہونے کا خیال بھی آتا ہے۔ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہونا تو ایک فطری بات ہے؛ مگر محتاج ہونا یتیم کا ضروری نہیں؛ اس لیے کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ یتیم کے پاس اس کے باپ کا چھوڑا ہوا بہت کچھ ہوتا ہے، یا کسی دوسرے رشتہ دار کی طرف سے اُسے کافی کچھ ملا ہوا ہوتا ہے یا ذاتی ملکیت بھی ہوتی ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم رہنا ضروری ہے کہ یتیمی بالغ ہونے سے پہلے ہوتی ہے، بالغ ہونے کے بعد آدمی یتیم نہیں کہلاتا، یہ شرعی اصطلاح ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا يُتْمَ بَعْدَ حُلُمٍ. (مجمع الزوائد ۵۳۱۷) یعنی بلوغت کے بعد یتیمی نہیں ہے؛ لیکن ہم اپنے عرف میں جوان بلکہ بوڑھے کو بھی باپ کے مرنے کے بعد یتیم کہہ دیتے ہیں، یہ شرعاً معتبر تعبیر نہیں ہے۔

اس تمہید کے بعد یہ سمجھنا چاہیے کہ (الف) اسلام کا نظام میراث مستقل اصول وضابطے پر مبنی ہے، قرآن وسنت میں سارے حصوں کی صراحت موجود ہے۔

(ب) یہ انسان کا بنایا ہوا قانون نہیں ہے کہ اس میں تبدیلی ہوسکے، یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا قانون ہے، اس میں ذرا برابر کم وکاست کرنا انسان کے بس میں نہیں؛ چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہوں! اس لیے حضرت سعد بن الربیعؓ کی بیوی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے انتظار کا حکم فرمایا اگر آپ کے بس میں ترکہ کی تعیین ہوتی تو آپ خود متعین فرما کر تقسیم فرما دیتے۔

(ج) پھر یہ سمجھنا چاہیے کہ انسان جب تک زندہ رہتا ہے، وہ اپنے مال ودولت کا مالک رہتا ہے، اپنی زندگی میں وہ کسی کو دینا چاہے تو دے سکتا ہے، اپنے مال سے لین دین کے سارے معاملات کرسکتا ہے اور مرنے کے بعد کے لیے وہ ایک تہائی وصیت کرسکتا ہے اور اگر اس نے ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کی ہے اور اس کے سارے ورثا، عاقل وبالغ ہیں تو تہائی سے زیادہ میں بھی وصیت جاری کرسکتے ہیں۔

(د) ترکہ کی تقسیم کا مدار سِ شریعت نے قرابت (نزدیکی رشتے) پر رکھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے:

أَلحقوا الفرائِضَ بأَهْلِهَا فما بَقِيَ فَهُوَ لِأَوْلٰی رَجُلٍ ذکرٍ. (بخاری ۲/۹۹۷، مشکوٰۃ ۲۰۴۲)

ترجمہ: (میراث کے) حصے، حصّے والوں کو دے دو پھر جو بچے تو وہ بہت قریب آدمی یعنی مرد کے لیے ہے۔

محتاجی پر ترکہ کا مدار نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو مال داروں کے وارث فقراء ومساکین ہوتے، میت کے مال دار بیٹے، پوتے، باپ، دادا، بیوی اور بھائی بہن نہ ہوتے۔

(ھ) اسی طرح یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ترکہ قریب ترین کو ملتا ہے اور دور والے محروم رہتے ہیں، اس کی صراحت ''الاقربون'' کی تعبیر کے ساتھ سورہ نساء (۷، ۳۳) میں تین جگہ آئی ہے۔ اسی کو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس طرح تعبیر فرمایا ہے:

الأصلُ فيه أن الأقرب يَحْجُبُ الأبْعَدَ حِرماناً. (حجۃ اللہ البالغہ ۲/۳۷۵ مکتبہ حجاز دیوبند)

ترجمہ: ترکہ میں بنیاد یہ ہے کہ نزدیک والا دور والے کو بالکل محروم کر دیتا ہے۔

یہی شریعت کا تقاضا ہے اور عقل کا بھی؛ اگر ایسا نہ ہو اور قریب اور دور سب کو ترکہ ملے تو ہر آدمی آدم کی اولاد ہے، ساری دنیا اس میں شامل ہوگی اور دنیا کے سب سے بڑے مال دار آدمی کا ترکہ بھی ہر انسان کو نہیں پہنچ سکتا اور ایسا کرنا عملاً محال بھی ہے۔

ہر انسان اپنی زندگی میں جو کچھ کماتا ہے اُسے اپنے قریب اہل وعیال، باپ دادا وغیرہ پر خرچ کرتا ہے اور مرنے کے وقت اس کے دل کا داعیہ ہوتا ہے کہ اس کا ترکہ اُس کے قریب سے قریب وارث کو ملے۔

جب مذکورہ بالا پانچوں باتیں تسلیم ہیں تو یہ بھی سمجھیے کہ انھیں اصول کی بنیاد پر باپ کے ہوتے ہوئے دادا کو نہیں ملتا ہے اور دادی وارث نہیں ہوتی ہے؛ حالاں کہ دادا دادی کمزور ضعیف اور محتاج بھی ہوتے ہیں، ماں کے ہوتے ہوئے میت کی نانی کو نہیں ملتا اور نانا کو بھی نہیں ملتا؛ حالاں کہ نانا نانی بھی ضعیف اور محتاج ہوتے ہیں اور بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے پوتیوں کو نہیں ملتا، چاہے اُن کے والد زندہ ہوں یا مر چکے ہوں بیٹی موجود ہو تو نواسوں نواسیوں کو ترکہ نہیں ملتا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کسی آدمی کے کئی بیٹے ہوں، ان میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے اور ان کی یتیم اولاد موجود ہو تو دادا کے ترکہ میں ان کا حق ہونا چاہیے؛ مگر یہ درست نہیں ہے،

یہ موقف قرآن مجید کے خلاف ہے اور عقل ودانش کے بھی خلاف ہے کہ میت کے بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے کو دے دیا جائے (جواہر الفقہ ۷/ ۵۳۷، زکریا بک ڈپو دیوبند)۔

ضروری نہیں کہ پوتا چچاؤں کے مقابلے میں محتاج ونادار ہوں، دوسرے یہ کہ غربت کو اگر میراث کا معیار بنایا جائے تو میراث کا خدائی قانون پامال ہوکر رہ جائے گا۔

اجماع صحابہ

قرآن پاک اور حدیث شریف سے استدلال اوپر ذکر کیا گیا، یہاں اجماع صحابہ پیش کیا جارہا ہے؛ چنانچہ علامہ ابن حزم ظاہری رقم طراز ہیں:

وَلَا يَرِثُ بَنُو الابنِ مع الابنِ الذَّكَرِ شيئًا أباهم كانَ أو عَمُّهُمْ. وهٰذا نَصُّ كلامِ النبي صلى اللّٰه عليه وسلم (في قولهِ فلأولىٰ رجلٍ ذكرٍ) وإجماعٌ مُتَيَقنٌ. (المحلی ۲۷۱/۹)

ترجمہ: بیٹے کی موجودگی میں پوتے کسی چیز کے وارث نہیں ہوتے، ان کے باپ (زندہ) ہوں یا چچا زندہ ہوں، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی صراحت ہے اور قابلِ اطمینان اجماع ہے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ صحابہ کے درمیان علم فرائض میں بڑا اونچا مقام رکھتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وأعْلَمُهَا بالفرائض زيدٌ.

ترجمہ: علم میراث میں زید ان میں سب سے بڑے عالم ہیں۔

ان کا ارشاد ہے:

ولد الأبناء بِمَنْزِلَةِ الْوَلَدِ إذ لَم يَكُنْ دُوْنَهُمْ وَلَدٌ، ذَكَرٌ ذَكرُهم كذكرِهم وأناثهم كأناثهم يرثون كما يرثون ويحجبون كما يَحْجُبُونَ ولا يرث ولد الابن مع الابن. (بخاری، کتاب الفرائض، باب ۷، عینی ۲۳/ ۲۳۸)

ترجمہ: پوتے پوتیاں لڑکے لڑکی کے درجے میں ہیں، جب کہ اُن سے قریب کا کوئی لڑکا نہ ہو، ان کے لڑکے (پوتے) لڑکوں کی طرح اور ان کی لڑکیاں (پوتیاں) لڑکیوں کی طرح ہیں وہ وراثت پائیں گے جس طرح وہ (بیٹے بیٹی) وراثت پاتے ہیں اور حاجب بنیں گے جیسے وہ حاجب بنتے ہیں اور پوتا پوتی، بیٹے کے ساتھ وارث نہیں ہوتے۔

"يُوصيكم اللّٰهُ في أولادكم" (نساء :۱۱) میں اولاد سے مراد بلاواسطہ صلبی لڑکے لڑکیاں ہیں اور اگر بیٹے نہ ہوں تو بیٹے کے بیٹے بیٹیاں اولاد کے قائم مقام ہوں گے اور یہ بھی نہ ہوں تو پوتے کے لڑکے اور لڑکیاں اولاد کے قائم مقام ہوں گے اور ذوی الفروض کو دینے کے بعد مذکر کو دو مؤنث کے

برابر والے قاعدے (نساء:۱۱) سے ترکہ تقسیم ہوگا۔

ناانصافی

اگر یتیم پوتوں کو دیا جائے اور جو بیٹے زندہ ہیں اُن کے بیٹوں کو نہ دیا جائے تو یہ بھی ناانصافی کی بات ہوگی کہ دادا کے ترکہ میں سے کچھ پوتوں کو ملا اور کچھ کو محروم رکھا گیا اور جن کے والد کو ملا ہے وہ اُن تک پہنچ جائے، اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے اور اگر پہنچے گا بھی تو اپنے والد کا ترکہ ہوگا، دادا کا ترکہ نہیں کہلائے گا۔

اشکال (۱) اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ روایت میں "لایَرِثُ ولد الابن مَعَ الابنِ" ہے، یہاں ابن سے مراد زندہ لڑکا ہے، زندہ لڑکے کا بیٹا ترکہ نہیں پائے گا اور جس کا والد مرگیا ہے اس کا لڑکا ترکہ پائے گا۔

جواب: تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس عبارت کا یہی مطلب ہوتا تو عبارت یوں ہوتی "لا یرثُ الابن مع أبیه" کہ بیٹا اپنے باپ کے ساتھ وارث نہیں ہوگا۔

اشکال کرنے والے نے شریعت کے خلاف اپنے من سے یہ مطلب بنایا ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ بیٹا کی موجودگی میں ہر طرح کا پوتا اور ہر طرح کی پوتیاں محروم ہوتی ہیں، پوتے کے محروم ہونے والی عبارت کو زندہ بیٹوں کے بیٹے کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

اشکال (۲): یتیم پوتے ''اَبعد'' (دور) نہیں ہیں؛ اس لیے کہ جب باپ تھا تو یہ ''ابعد'' تھا باپ اقرب تھا، باپ کے مرنے کے بعد یہ پوتا اپنے باپ کی جگہ میں ہوکر قریب ہوگیا؛ اس لیے اقرب ہونے کی وجہ سے ترکہ ملنا چاہیے!

جواب: پوتا اپنے باپ کے واسطے سے ہی دادا کا پوتا ہوتا ہے اور یہ اَبعد ہی ہے، باپ کے زندہ ہوتے ہوئے بھی اور مرنے کے بعد بھی، دونوں صورتوں میں وہ پوتا ہی رہے گا، بیٹا نہیں بن سکتا اور نہ وراثت لینے کے لیے بیٹے کی جگہ آسکتا ہے۔

اس طرح اگر ''ابعد'' کو اقرب بنایا جائے تو بڑی خرابی لازم آئے گی، اقرب کے مرنے کے بعد ہر ابعد اقرب ہوجائے گا اور باپ کے مرنے کے بعد چچا اور پھوپی اور ماں کے مرنے کے بعد ماموں اور خالہ، باپ اور ماں کا ترکہ پالیں گی؛ حالاں کہ اس کا کوئی قائل نہیں، اس طرح تو اللہ کا بنایا ہوا نظام میراث درہم برہم ہوجائے گا، اللہ کے قانون کو ہم نہیں بدل سکتے۔

یتیم پوتوں کی مشکل کا حل

یتیم پوتوں کے ترکہ کے سلسلے میں جو احکام اوپر بیان ہوے وہ قرآن وسنت اور اجماعِ امت سے ثابت ہیں، اُن میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں، حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی چاروں مسالک متفق ہیں؛ اس لیے ان کو بدلنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر پوتا محتاج ہو تو اس کا سہارا کون بنے گا؟ کیا اسلام میں اس کی بے چارگی دور کرنے کی کوئی شکل ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ درج ذیل شکلوں میں اس کی آشک شوئی کا سامان موجود ہے۔

۱- سب سے پہلا ذمہ دار اس کا دادا ہے، محض دادا کی وجہ سے اسلام بدنام ہو رہا ہے، مسئلہ کا پہلا حل اسی کے ہاتھ میں ہے، اس کی دو شکلیں ہیں:

(الف) اگر وہ چاہے تو ہبہ کردے، عطیہ کے طور پر جتنا چاہے دے دے؛ لیکن وہ اتنا ہی دے جس سے دوسری اولاد کا نقصان نہ ہو، (جواہر الفقہ ۷/ ۵۳۸) اور دے کر رجسٹرڈ کردے؛ تاکہ بعد میں دوسرے ورثاء پریشان نہ کریں۔

(ب) اس کا دوسرا حل یہ ہے کہ وہ اپنے مال میں سے ایک تہائی یا اس سے کم کی وصیت کردے اور اس کو رجسٹرڈ کردے؛ تاکہ مرنے کے بعد پوتوں کو بھی مل جائے۔

مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کا مثالی اقدام

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد پالن پوریؒ نے اپنے بڑے صاحب زادے مفتی رشید احمدؒ کے انتقال کے بعد اُن کے دونوں بیٹے مسیح اللہ اور سمیع اللہ کے لیے اپنے دو بیٹوں کے برابر وصیت کی، بیٹوں کو جمع کر کے فرمایا کہ اگر میں چاہوں تو ان کے لیے ایک تہائی ترکہ کی وصیت کرسکتا ہوں؛ مگر اس طرح تم سب کا حصہ کم پڑ جائے گا؛ اس لیے بہتر یہ ہے کہ میرے مرنے کے بعد ان دونوں کو اپنا دو بھائی تصور کر کے تقسیم کر لینا۔ اس پر سب نے ہامی بھری۔ جب تک زندہ رہے اپنے بیٹوں کی طرح ان کی پرورش فرمائی اور وفات کے بعد اُن کو وصیت کیا ہوا ترکہ ملا، ہر دادا کو ایسا ہی کرنا چاہیے؛ تاکہ یتیم کی پرورش ہو اور اسلام پر اعتراض کرنے والوں کی زبان بند ہو جائے۔

۲- جب تک یتیم، نابالغ اور کمانے سے عاجز ہے تب تک اس کا نفقہ (خرچہ) چچا پر واجب ہے۔ (عالم گیری ۱/ ۵۸۵ کتاب النفقات)

علامہ شامیؒ نفقۂ اقارب کی ترتیب پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’جب باپ کے پاس مال نہ ہواور دادا، یا ماں، یا ماموں یا چچا خوش حال ہوجائے تو وہ اس پر کیے ہوئے اخراجات کے لیے رجوع کریں، اسی طرح اگر قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں تو دور کے رشتہ دار کو نفقہ دینے پر مجبور کیا جائے گا۔ اگر ماں خوش حال ہو تو ماں پر نفقہ ہوگا اور وہ بعد میں اس کے باپ سے وصول کرے گی، اسی طرح اگر باپ نہ ہو تو مذکورہ رشتہ داروں کو نفقہ پر مجبور کیا جائے گا۔ (ردالمحتار ۵/ ۲۳۵ باب النفقہ)

۳- یتیم پوتے کا والد اگر ترکہ چھوڑ کر مرا ہو تو پوتوں کے لیے وہی کافی ہوگا۔ اس کو پریشانی نہیں ہوگی۔ اس صورت میں اگر چچا اور اس کے لڑکے غریب ہوں تو کیا ان یتیموں کا مال چچا اور چچازادوں کو دیا جائے گا؟ ہرگز نہیں!

۴- انسانوں کے گزارے کے لیے ترکہ ہی ضروری نہیں ہے؛ اس لیے کہ بہت سے لوگ بچوں کو یتیم اور محتاج چھوڑ کر مر جاتے ہیں، آخر ان کی پرورش کا کوئی نہ کوئی انتظام ہو ہی جاتا ہے، اسی طرح اس محتاج یتیم کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ (جواہر الفقہ ۷/ ۵۳۸)

۵- یتیموں کی کفالت کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے، سرکاری خزانہ سے اس کی کفالت ہوگی، اور اگر حکومت اسلامی ہے تو بیت المال سے یتیموں کو اخراجات دیے جائیں گے۔

۶- اگر یتیم کا کوئی نہیں ہے تو عام مسلمانوں پر اس کا انتظام کرنا لازم ہوگا؛ اس لیے ضروری ہے کہ ’’یتیم خانہ‘‘ ہر علاقے میں ہو جو ان کی کفالت کرے!

❋ ❋ ❋

مراجع

(۱) قرآن کریم، سورۂ نساء

(۲) صحیح بخاری، مکتبہ اصح المطابع میرٹھ

(۳) حجۃ اللہ البالغہ، مکتبہ حجاز دیوبند

(۴) مفید الوارثین، دارالاشاعت دیوبند ۱۳۴۹ھ

(۵) جواہر الفقہ، جلد ۷، زکریا بک ڈپو دیوبند

(۶) اسلام پر بے جا اعتراضات، مکتبہ نعیمیہ دیوبند

(۷) ماہ نامہ تکبیر مسلسل مارچ ۲۰۱۷م

(۸) ہدایہ ثانی مکتبہ بشریٰ کراچی

میدانِ تیہ، کوہِ طور، وادیِ مقدس اور صحرائے سینا: ایک تعارف

از: مفتی محمد خالد حسین نیموی قاسمی
رکن الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین

ہفتہ وار مجلس درسِ قرآن کریم میں حاضرین وسامعین کی طرف سے بسا اوقات بڑے خوبصورت اور اہم سوالات سامنے آتے رہتے ہیں، اس ہفتہ کے درسِ قرآن میں ایسا ہی ایک خوبصورت علمی سوال مفتی نفیس احمد قاسمی سلمہ کی طرف سے سامنے آیا۔ سوال تھا ''میدان تیہ'' سے متعلق کہ میدان تیہ کسے کہتے ہیں اور فی الحال وہ کس ملک میں واقع ہے اور اس کی تاریخ اور جغرافیہ کیا ہے؟ فوری طور پر اختصار کے ساتھ اس کا جواب دیا گیا۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی ہوا کہ عام طور پر ترجمہ وتفسیر قرآن کریم سے دل چسپی رکھنے والے افراد کے ذہنوں میں اس طرح کے سوالات آتے رہتے ہیں؛ اس لیے مناسب ہے کہ ''میدانِ تیہ، کوہ طور، وادی مقدس اور صحرائے سینا'' کی تفصیلات کو ایک مضمون کی شکل میں پیش کیا جائے۔

''میدان تیہ'' مصر اور شام کے درمیان ستائیس میل کا ایک وسیع وعریض میدان ہے۔ اسے ''وادی تیہ'' اور ''صحرائے سینا'' بھی کہتے ہیں۔ یہ جزیرہ نمائے سینا کا ایک حصہ ہے، مکمل جزیرہ نمائے سینا تقریبا 67 ہزار مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ فی الحال یہ خطہ عربی جمہوریہ مصر کا حصہ ہے۔

اس کے شمال میں بُحیرہ روم، مغرب میں خلیج سویز اور نہر سویز، مشرق میں فلسطین (غزہ کی پٹی اور اسرائیل)، خلیج عقبہ، اور جنوب میں بحیرہ احمر (لال سمندر، بحر قلزم) واقع ہے۔ اسے براعظم افریقہ اور ایشیا کے درمیان لنک سمجھا جاتا ہے، اس وادی سے اللہ کے برگزیدہ نبی حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام اور ان کی قوم بنی اسرائیل کے بہت سے آثار وابستہ ہیں، اسی میدان میں بنو اسرائیل اپنے نبی حضرت موسیٰ کے ساتھ گستاخانہ اور عدم تعاون کا رویہ اختیار کرنے کی وجہ سے چالیس سال تک

مارے مارے پھرتے رہے۔ ''تیہ'' عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں سرگرداں رہنا، گھومتے رہنا۔ تیہ لق ودق بیابان یا ایسے بیابان کو بھی کہتے ہیں جس میں مسافر گم ہوجائے۔

چوں کہ بنی اسرائیل اس میدان میں دن رات چلتے رہتے تھے؛ لیکن اس میدان کو قطع نہیں کر پاتے تھے وہ صبح کو جہاں سے چلنا شروع کرتے شام کو پھر وہیں پہنچ جاتے تھے اور شام کو جہاں سے چلتے تھے صبح وہیں پہنچ جاتے تھے؛ اسی لیے وادی سینا کے اس حصے کا نام وادی تیہ یا میدان تیہ پڑ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے بنواسرائیل کی اس کیفیت کی عکاسی کرنے کے لیے "یتیھون" کا جملہ استعمال فرمایا۔

قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (۲۶)

ترجمہ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: پس چالیس سال تک وہ زمین ان پر حرام ہے، یہ زمین میں بھٹکتے پھریں گے، تو (اے موسیٰ!) آپ (اس) نافرمان قوم پر افسردہ نہ ہوں۔

اُس وقت یہ وادی ایک چٹیل میدان کی طرح تھی، اس وادی میں نہ کوئی سایہ دار درخت تھا اور نہ ہی کوئی عمارت تھی، ان کے پینے کے لیے نہ تو پانی میسر تھا، نہ کھانے کے لیے کوئی چیز نہ ضروریات زندگی کے دیگر لوازمات؛ اس بے سروسامانی کے عالم میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی قوم کی حالت پر بڑا ترس آیا اور بدحالی کو دور کرنے کے لیے رب العالمین سے دعا کی، ان کی دعا سے ان کے لیے راحت کے سب سامان مہیا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دھوپ سے بچاؤ اور سایہ کے حصول کے لیے بادل بطور سائبان نازل فرمادیا، کھانے کے لیے من وسلویٰ بھیج دیا۔

اسی خطہ میں واقع پہاڑ کو قرآن کریم میں ''طور سینا'' بھی کہا گیا ہے اور ''طور سینین'' بھی۔ اسے ''جبل موسیٰ اور جبل طور'' بھی کہتے ہیں۔ "سینین" دراصل جزیرہ نمائے سینا ہی کا دوسرا نام ہے، اب یہ سارا ہی علاقہ جس میں کوہ طور واقع ہے اور جواب مصر کے قبضہ میں ہے، ''صحرائے سینا'' کے نام سے مشہور ومعروف ہے۔ سینین بنیادی طور پر اس خطہ کا نام ہے؛ البتہ اس کے کئی اور معانی بھی آتے ہیں، جن میں ''خوب صورت، اچھا، وہ پہاڑ جس پر گھنے یا پھل دار درخت ہوں، شامل ہیں۔ طور سینین کو سورۃ المومنون کی آیت نمبر 20 میں طور سینار کہا گیا ہے اور آج کل بھی سینار کا نام سینار ہی ہے۔

صحرائے سینا اور کوہ طور یہ دونوں مصر کے ایشیائی حصے میں ہیں، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ آپ اگر زمین کا نقشہ دیکھیں تو آپ کو لال سمندر (بحیرۂ احمر) غلیل کی وی (V) کی طرح دو حصوں میں بہتا نظر آئے گا، غلیل کی یہ وی درمیان میں مثلث بناتی ہے اور یہ مثلث سینا کہلاتا ہے، مثلث کی نوک پر

مصر کا سیاحتی شہر ''شرم الشیخ'' آباد ہے؛ جب کہ اوپری حصہ چار ملکوں اور بحیرہ روم سے جاٹکراتا ہے، وہ چار ملک سعودی عرب اردن فلسطین، اسرائیل اور مصر ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام دومرتبہ اس مثلث یعنی جزیرہ نمائے سینا میں داخل ہوئے۔ آپ پہلی بار اس وقت سینا میں آئے جب آپ فرعون کے لے پالک صاحبزادے تھے آپ کی پرورش محل میں ہوئی تھی، آپ فرعون کے وارث بن رہے تھے؛ لیکن پھر ان سے نادانستہ طور پر ایک قبطی قتل ہوگیا اور آپ سزا اور فرعون کے ظلم سے بچنے کے لیے سینا میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ سینا اس وقت فرعون کی سلطنت میں شامل نہیں تھا، حضرت موسیٰ صحرا میں چلتے چلتے مدائن پہنچ گئے، دوسری بار جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے بنواسرائیل کو فرعون اور اس کے لشکر سے نجات عطا کی۔

آپ نے بنی اسرائیل کو ساتھ لیا، اپنے عصا سے ''ریڈسی'' کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور بنی اسرائیل کے ساتھ دوبارہ صحرائے سینا میں داخل ہوگئے؛ جب کہ فرعون اپنی فوج سمیت ریڈسی میں غرق ہوگیا۔ فرعون سے نجات پاکر آپ اپنی امت کے ساتھ کوہ طور کے گرد پناہ گزین ہوگئے۔

سورۂ تین میں اللہ تعالیٰ نے طور سینین کی قسم بھی کھائی ہے، ''سینا/سینین'' ایک بلند پہاڑ ہے جو مصر سے مدین یا مدین سے مصر جاتے ہوئے راستہ میں پڑتا ہے۔ اسی پہاڑ کی ایک چوٹی کا نام ''طور'' ہے۔ اسی پہاڑی پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی وہ تجلی دکھائی تھی جس کے اثر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوگئے تھے۔

اس واقعہ کی طرف سورہ اعراف آیت 143 میں اشارہ کیا گیا ہے: وَ لَمَّا جَآءَ مُوۡسٰی لِمِیۡقَاتِنَا وَ کَلَّمَہٗ رَبُّہٗ (١٤٣).

ترجمہ: اور جب موسیٰ ہمارے وعدے کے وقت پر حاضر ہوا اور اس کے رب نے اس سے کلام فرمایا، تو اس نے عرض کی: اے میرے رب! مجھے اپنا جلوہ دکھا؛ تاکہ میں تیرا دیدار کرلوں۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا؛ البتہ اس پہاڑ کی طرف دیکھ، یہ اگر اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تو عنقریب تو مجھے دیکھ لے گا پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنا نور چمکایا تو اسے پاش پاش کردیا اور موسیٰ بے ہوش ہوکر گر پڑے، پھر جب ہوش آیا تو عرض کی: یا رب تو پاک ہے، میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔

صورتِ حال یہ بنی تھی کہ جب حضرت موسیٰ عَلَیۡہِ السَّلَام نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا؛ تو کلام ربانی کی لذت نے انھیں اللہ عَزَّ وَجَلَّ کے دیدار کا مشتاق بنادیا؛ چنانچہ شدت شوق میں بارگاہِ الٰہی میں

عرض کی: اے میرے رب! مجھے اپنا جلوہ دکھا دیجیے؛ تاکہ میں تیرا دیدار کرلوں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ''طور'' کی قسم بھی کھائی ہے اور اس نام سے ایک مکمل سورہ بھی اتاری ہے۔ کوہِ طور ان مقامات میں سے ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے خصوصی تقدس عطا فرمایا ہے۔

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ طور سینا میں مختلف واقعات رونما ہوئے ہیں؛ جن میں حضرت موسیٰ کا اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونا، چالیس دن کا میقات، بنی اسرائیل کے 70 لوگوں کے ساتھ میقات پر جانا اور حضرت موسیٰؑ کی وفات شامل ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات اردن میں ''کوہِ نبوٗ'' کے دامن میں ہوئی۔ اسی پہاڑ کے دامن میں ایک وادی ہے جس کا نام ''طویٰ'' ہے جسے قرآن میں وادی مقدس اور البقعۃ المبارکہ بھی کہا گیا ہے۔ اسی مقام پر موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا کی گئی اور دو دفعہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا۔

قرآن میں اس کا ذکر دو جگہ ہے۔ سورہ 20 آیت 12 میں فرمایا: بیشک میں ہی تمہارا رب ہوں سو تم اپنے جوتے اتار دو، بیشک تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔

اسی طرح سورہ 79 آیت 16 میں فرمایا: جب ان کے رب نے طویٰ کی مقدّس وادی میں انھیں پکارا تھا۔

کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام دو مرتبہ گئے تھے۔ پہلا واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب موسیٰ وادی مقدس میں آگ کی تلاش میں تھے اور وادی میں چمکنے والا شعلہ دراصل خدا کے وجود کا نشان تھا۔ اس وقت موسیٰ کو خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا اور انھیں خدا کی طرف سے معجزات عطا کیے گیے۔ اس واقعے کا تلمیحی استعمال ان مرکبات سے ہوا ہے۔ وادیِ ایمن، شجر ایمن، آگ، وادیِ مقدس، شعلہ سینا وغیرہ۔ دوسرا واقعہ اس وقت پیش آیا جب موسیٰ نے اپنی قوم کو فرعون کے قہر سے نجات دلا کر وادیِ سینا میں قیام کیا۔ اس وقت موسیٰ کو بنو اسرائیل کی ہدایت و رہنمائی کے لیے شریعت عطا کرنے کے لیے کوہِ طور پر بلایا گیا۔ شروع میں انھیں تیس راتوں کے لیے بلایا گیا تھا بعد میں دس راتوں کا اور اضافہ کر دیا گیا۔ جب موسیٰ کے چالیس دن پورے ہوئے تو انھیں شریعت عطا کی گئی اور اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ موسیٰ کو اللہ تعالیٰ کے دیدار کا شوق ہوا، انھوں نے درخواست کی موسیٰ کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے کہا: ''لن ترانی''، تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ ہم اپنی تجلی کا ظہور اس پہاڑ پر کریں گے، اگر یہ اپنی جگہ برقرار رہا تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کوہِ طور پر اپنی تجلی کا ظہور کیا وہ پہاڑ تجلی کو برداشت نہ کرسکا اور پارہ پارہ ہوگیا۔ موسیٰ بھی بے ہوش

ہوکر گر پڑے اور اپنی عاجزی کا اعتراف کیا۔اس واقعہ کا تلمیحی استعمال شعروادب میں اس کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے کثرت سے ہوا ہے۔کچھ تلمیحی مرکبات یہ ہیں۔''برقِ طور، ارنی،لن ترانی''۔ ان واقعات کے تلمیحی اشارات کو ان شعروں میں برتا گیا ہے۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آو نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

غالب

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

غالب

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہِ طور کا

سودا

یار کے دیدار کا طالب ہے موسیٰ ہر زماں
اے ولی! دربار اس کا اس کوں کوہ طور ہے

ولی دکنی

طور تو ہے ''رب ارنی'' کہنے والا چاہیے
''لن ترانی'' ہے مگر نا آشنائے گوش ہے

فانی بدایونی

دیکھ سکتا جو تجلّی رخ جاناں کو
''لن ترانی'' کا سزا وار نہ موسیٰ ہوتا

ذوق

دل ہی نگاہِ ناز کا ایک ادا شناس تھا
جلوہ ''برقِ طور'' نے طور کو کیوں جلا دیا

فانی بدایونی

بنی اسرائیل کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گستاخانہ رویہ کی تفصیل یہ ہے کہ جب

حضرت موسیٰ مصر سے اپنی قوم کو لے کر نکلے تو فرعون اور اس کی فوج نے آپ کا تعاقب کیا، اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کو سمندر میں غرق کر دیا اور موسی علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو نجات عطا فرمائی۔ حضرت موسیٰ اپنی قوم بنو اسرائیل کے ساتھ سمندر عبور کر کے بحکم الٰہی صحرائے سینا میں ٹھہرے، وہیں آپؑ کو اللہ رب العالمین کی طرف سے کوہِ طور پر بلایا گیا اور کتاب ہدایت ''تورات'' عطاء کی گئی۔ اس کے بعد آپؑ کو حکم ہوا کہ آپ اپنی قوم بنی اسرائیل کے ساتھ فلسطین میں آباد مشرک اور کافر قوم (جو فلسطی کہلاتے تھے) کے ساتھ جہاد کر کے انھیں وہاں سے نکال دیں اور اپنی قوم کے ساتھ اس مقدس شہر میں داخل ہو جائیں اور وہیں مستقل بود و باش اختیار کریں؛ کیونکہ یہ ارضِ مقدس آپ کے لیے اللہ کی طرف سے موعود ہے۔

ان کے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما السلام کا تعلق اس خطہ سے تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے میں حضرت یوسف علیہ السلام کی وساطت سے بنی اسرائیل مصر میں منتقل ہوئے۔ پھر جب حضرت موسیٰؑ انھیں مصر سے لے کر نکلے تو انھیں حکم ہوا کہ اب جاؤ اپنے اصل گھر (ارضِ فلسطین) کو دوبارہ حاصل کرو؛ لیکن جب جنگ کا موقع آیا تو پوری قوم نے کورا جواب دے دیا کہ ہم جنگ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اس کم ہمتی کی وجہ سے انھیں وادی تیہ میں بھٹکنا پڑا۔

چالیس سال تک صحرائے سینا میں بھٹکتے رہے، یہاں تک کہ ان کے وجود سے چار سو سال کی غلامی کے اثرات ختم ہو گئے اور وہ ایک نارمل اور آزاد انسان اور آزاد قوم بن گئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی سن لی انھیں صحرا سے نکلنے کا راستہ مل گیا، اس کے بعد حضرت یوشع بن نون کے عہدِ خلافت میں بنی اسرائیل اس قابل ہوئے کہ فلسطین فتح کر سکیں۔

متعدد آیات کی تفسیر میں میدان تیہ، کوہ طور، وادی مقدس اور جزیرہ نمائے سینا کی تفصیلات متعدد مورخین و مفسرین واہل جغرافیہ نے لکھی ہے۔ ان سب کا خلاصہ پیش کیا گیا، و باللہ التوفیق!



پہلی صدی ہجری کی مشہور فقیہ خواتین

از: عصمت اللہ نظامانی
جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن۔ کراچی

اسلام نے مرد وعورت دونوں کو علم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے؛ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح مرد کو تعلیم دیتے تھے، انھیں قرآن پاک اور دین کے احکام سکھلاتے تھے، اسی طرح خواتین کی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح مرد میں فقہا ومحدثین اور دیگر علوم وفنون میں مہارت رکھنے والے پیدا ہوئے، اسی طرح خواتین میں بھی بلند پایہ عالمات، محدثات، فقیہات گزری ہیں، علمی میدان میں خواتین کسی طرح بھی مرد حضرات سے پیچھے نہیں رہیں، اگرچہ تعداد کے اعتبار سے کمی بیشی ہوسکتی ہے۔

ذیل میں ہم ان فقیہ خواتین کا تذکرہ کریں گے، جنھوں نے یا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ تربیت فقہ کی تعلیم حاصل کی، یا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ افراد سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ یعنی پہلی صدی ہجری کی مشہور فقیہ خواتین کا مختصر تذکرہ کریں گے جن کے فقیہ ہونے کی گواہی اہلِ علم نے دی ہے۔

واضح رہے کہ صحابیات وغیرہ ایک بڑی جماعت کو فقہ کے ساتھ خصوصی شغف اور اس میں مہارت حاصل تھی اور بجا طور وہ ''فقیہ'' کہلانے کی مستحق تھیں؛ لیکن ذیل میں ہم نے پہلی صدی کی صرف ان خواتین کے تذکرے پر اکتفا کیا ہے جن کے فقیہ ہونے کی اہلِ علم نے تصریح کی ہے۔

پہلی فقیہ خاتون

امّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

امّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق کی دختر ہیں، ان کی والدہ کا نام ام

رومان تھا، نوسال کی عمر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئی تھیں، فتاوی اوراحادیث دونوں لحاظ سے ان کا شمار ''مکثرین'' میں ہوتا ہے، حضور ﷺ کی رحلت کے وقت ان کی عمر اٹھارہ سال تھی، احادیث میں ان کے متعدد مناقب وارد ہوئے ہیں، سن ۵۸ھ میں ان کا انتقال ہوا، اور جنت البقیع میں سپرد لحد کیا گیا۔(۱)

حضرت عائشہ کی فقاہت

حافظ ابن حجر(۲)، علامہ زرکشی(۳) اور بعض دیگر حضرات انھیں فقیہہ کہا ہے۔ نیز متعدد بلند پایہ اہلِ علم نے ان کی فقہی بصیرت، قوتِ استدلال اور علم میں پختگی کی گواہی دی ہے؛ چنانچہ حضرت ابوموسی اشعری فرماتے ہیں:

ما أشكل علينا أصحاب رسول الله صل الله عليه و سلم حديث قط فسألنا عائشة إلا و جدنا عندها منه علماً.(۴)

جب ہم لوگوں یعنی حضور ﷺ کے صحابہ کو کسی حدیث کے بارے میں اشکال ہوتا اور پھر اس کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھتے تو ان کے پاس لازماً اس کا علم ہوتا تھا۔

حضرت عطا فرماتے ہیں:

كانت عائشةُ أفقهَ الناسِ و أعلمَ الناس(۵).

حضرت عائشہ لوگوں میں سب سے زیادہ فقیہ اور زیادہ علم والی تھیں۔

حضرت عروہ بن زبیر فرماتے ہیں:

ما رأيت أحدًا أعلمَ بفقهٍ ولا بطبٍ ولا بشعرٍ من عائشة.(۶)

میں نے حضرت عائشہ سے بڑھ کر فقہ، طب اور شعر کا علم رکھنے والا نہیں دیکھا۔

حضرت مسروق کا بیان ہے:

رأيت مشيخة أصحاب محمد الأكابر يسألونها عن الفرائض.(۷)

میں نے حضور ﷺ کے بڑے بڑے صحابہ کو دیکھا کہ وہ حضرت عائشہ سے میراث سے متعلق سوال کرتے تھے۔

دوسری فقیہ خاتون

امّ المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا

ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا نام ''ہند بنت ابی امیہ'' ہے، ان کا پہلا نکاح حضرت

ابوسلمہ کے ساتھ ہوا، ان کی وفات کے بعد سن 4ھ، میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا، امہات المؤمنین میں سے سب سے آخر میں ان کی وفات ہوئی، سن 62ھ کو مدینہ منورہ میں ان کا انتقال ہوا، اور انھیں جنت البقیع میں سپرد لحد کیا گیا۔(۸)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی فقاہت

علامہ ذہبی نے انھیں فقیہہ کہا ہے(۹)، اور متعدد احادیث سے کی ان کی فقاہت، فراست اور عمدہ ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے؛ چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقعے پر جب حضور ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کو عمرہ کیے بغیر حلق کرنے کا حکم دیا تو ابتدا میں صحابہ نے اس پر عمل نہیں کیا، وہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ انھیں عمرہ کرنے کا موقع مل جائے گا۔ جب حضرت ام سلمہؓ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے حضور ﷺ کو مشورہ دیا کہ آپ ﷺ خود اپنے بال کٹوالیں؛ چنانچہ جب صحابۂ کرامؓ نے حضور ﷺ کو بال کٹواتے دیکھا تو انھوں نے بھی ایک دوسرے کے بال کاٹنے شروع کردیے، اس طرح حضرت ام سلمہؓ کے مشورے پر عمل کرنے سے صحابۂ کرامؓ صدمہ کی حالت سے نکل آئے، اسی طرح ان کی فقاہت کی اور بھی کئی مثالیں موجود ہیں۔(۱۰)

تیسری فقیہ خاتون

امّ المؤمنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا

ام المؤمنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بنو مصطلق قبیلے کے سردار ''حارث'' کی بیٹی تھیں، غزوہ بنی مصطلق میں قید ہوکر آئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے بدلِ کتابت ادا فرما کر آزاد کیا اور پھر ان سے نکاح کیا۔ جب صحابۂ کرامؓ کو معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے ان سے نکاح کرلیا ہے تو انھوں بنی مصطلق کے تمام قیدیوں کو حضور ﷺ کے ساتھ رشتہ داری قائم ہونے کی وجہ سے آزاد کردیا؛ چنانچہ حضرت عائشہؓ ان کے بارے میں فرماتی ہیں:

فما أعلمُ امرأةً أعظمَ بركةً منها على قومِها.(۱۱)

میں کسی عورت کو نہیں جانتی جو اپنی قوم کے لیے حضرت جویریہ سے زیادہ بابرکت ہو۔

ماہِ ربیع الاول، سن 56ھ میں ان کی وفات ہوئی۔(۱۲)

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کی فقاہت

''نساء حول الرسول'' نامی کتاب کے مصنف محمد برہان نے حضرت جویریہ کو فقیہ کہا ہے(۱۳)؛ چنانچہ ان کے بعض فتاوی مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبدالرزاق میں موجود ہیں۔(۱۴)

چوتھی فقیہ خاتون

حضرت زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا

حضرت زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ربیبہ یعنی آپ کی زوجہ محترمہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی دختر تھیں؛ اس لیے وہ آپ ﷺ کی تربیت میں پروان چڑھیں، حضور ﷺ ان سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتے تھے؛ چنانچہ ایک مرتبہ وہ حضور ﷺ کے پاس گئیں، اس وقت آپ غسل فرما رہے تھے، تو آپ نے حضرت زینت بنت ابی سلمہ کے چہرے پر ازراہِ تلطّف پانی کے چھینٹے مارے، جس کی برکت سے عمر رسیدہ ہونے کے باوجود ان کے چہرے پر جوانی کی خوبصورتی اور شادابی باقی رہی۔[۱۵] ان کی وفات سن 74ھ میں ہوئی۔[۱۶]

حضرت زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا کی فقاہت

متعدد حضرات نے انھیں فقیہ کہا ہے؛ چنانچہ علامہ ابن اثیر جزری اور ابن عبدالبر نے ان کو "مِنْ أفقهِ نساءِ أهلِ زمانها" (اپنے زمانے کی سب سے بڑی فقیہ خواتین میں سے ایک) قرار دیا ہے۔[۱۷] اور حضرت ابورافع کہتے ہیں:

کنت إذا ذكرت امرأة بالمدينة فقيهة ذكرت زينب بنت أبي سلمة.[۱۸]

یعنی میں جب مدینے کی کسی فقیہ خاتون کا ذکر کرتا تو زینب بنت ابی سلمہ کا ہی تذکرہ کرتا تھا۔

پانچویں فقیہ خاتون

فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا

مشہور صحابیہ ہیں، ابتدائی ہجرت کرنے والی خواتین میں سے تھیں، ان کے پہلے شوہر ابوبکر بن حفص نے انھیں طلاق دی تھی اور عدت کے بعد متعدد حضرات نے ان کے پاس نکاح کا پیغام بھجوایا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے سے اسامہ بن زیدؓ سے نکاح کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد خلیفہ منتخب کرنے کے لیے اہلِ شوریٰ ان ہی کے گھر میں جمع ہوئے تھے۔[۱۹] ان کی وفات تقریباً سن 50ھ میں ہوئی۔[۲۰]

حضرت فاطمہ بنت قیس کی فقاہت

امام شعبی نے انھیں فقیہ کہا ہے؛ چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے مطلقہ (طلاق یافتہ عورت) کے لیے دورانِ عدت نفقہ اور رہائش کے عدم وجوب سے متعلق حضرت فاطمہ بنت قیس کی حدیث بیان کی تو

وہاں موجود ایک شخص نے کہا کہ حضرت عمر نے فاطمہ بنت قیس کی یہ روایت رد کردی تھی، اس پر امام شعبی نے فرمایا:

ألا أصدق امرأةً فقيهةً نزل بها هذا؟(۲۱)

کیا میں ایک فقیہ خاتون کی تصدیق نہ کروں جسے خود یہ مسئلہ پیش آیا تھا؟

چھٹی فقیہ خاتون

حضرت صفیہ بنت شیبہ رضی اللہ عنہا

حضرت صفیہ صغار صحابیات میں سے ہیں، ان کے والد شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ کعبہ کے محافظوں میں سے تھے، حضرت صفیہ بنت شیبہ حضور ﷺ سے بعض روایات بلا واسطہ نقل کرتی ہیں، نیز امہات المؤمنین میں سے حضرت عائشہ، حضرت ام حبیبہ اور حضرت ام سلمہ اور دیگر صحابہ سے روایت کرتی ہیں۔(۲۲) ولید بن عبد الملک کے دورِ خلافت میں سن 90ھ کو ان کی وفات ہوئی۔(۲۳)

حضرت صفیہ بنت شیبہ کی فقاہت

علامہ ذہبی نے ان کو فقیہ کہا ہے(۲۴) علم کے ساتھ گہرا شغف تھا، بہت سے حضرات نے ان سے احادیث لی ہیں، اصحاب سنن نے متصلاً ؛ جب کہ امام بخاری نے تعلیقاً ان کی روایت ذکر کی ہے۔(۲۵)

ساتویں فقیہ خاتون

حضرت ام درداء صغری

ان کا نام ''ہجیمہ بنت حیی'' ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معروف صحابی حضرت ابودرداء کی دوسری بیوی تھیں، ان کی پہلی بیوی کا نام ''خیرہ'' اور کنیت ام درداء کبری تھی، وہ صحابیات میں سے تھیں؛ جب کہ ام درداء صغری، تابعیہ ہیں، حضرت ابودرداء کی وفات کے بعد حضرت معاویہؓ نے ان کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا؛ لیکن انھوں نے انکار کردیا، سن 81ھ کو ان کا انتقال ہوا۔(۲۶)

حضرت ام درداء صغری کی فقاہت

امام بخاری(۲۷)، امام مکحول اور دیگر بہت سے اہل علم نے انھیں فقیہ کہا ہے،(۲۸) پوری زندگی انھوں حدیث وفقہ کی تعلیم حاصل کرنے اور پھر اس کی نشر واشاعت میں گزاری، خصوصاً فقہ میں تو انھیں بلند مقام حاصل تھا؛ چنانچہ علامہ نووی فرماتے ہیں:

واتفقوا على وصفها بالفقه.(۲۹) یعنی اہل علم کا انھیں فقیہ قرار دینے پر اتفاق ہے۔

آٹھویں فقیہ خاتون

حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن

حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن تابعیہ ہیں، اوران کے والد عبدالرحمٰن اور دادا سعد بن زرارہ دونوں صحابی ہیں، وہ مشہور محدث ابوبکر ابن حزم کی خالہ ہیں، بچپن سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کفالت اور پرورش میں رہیں، اسی وجہ سے حضرت عائشہ سے سب سے زیادہ احادیث روایت کرنے والوں میں سے ایک حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن بھی ہیں، ان کی تاریخِ وفات میں اختلاف ہے، ابوحسان زیادی اور بعض دیگر حضرات کہتے ہیں کہ ان کا انتقال سن 98ھ میں ہوا۔[۳۰]

حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن کی فقاہت

متعدد حضرات جیسے علامہ ذہبی[۳۱]، اور ہجرانی وغیرہ نے انھیں فقیہ کہا ہے۔[۳۲] حضرت عائشہ کے بھانجے حضرت قاسم بن محمد (جو مدینے کے فقہائے سبعہ میں سے ایک ہیں) نے مشہور محدث امام زہری سے ایک مرتبہ فرمایا: اے بچے! میں تم کو حصولِ علم کا حرص اور شوق رکھنے والا دیکھتا ہوں، کیا تمھیں علم کے خزانے کے بارے میں نہ بتاؤں؟ امام زہری نے کہا: کیوں نہیں، تو حضرت قاسم نے فرمایا: عمرہ بنت عبدالرحمٰن کی خدمت میں پابندی سے حاضر ہو۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ جب میں حضرت عمرہ کے پاس آیا تو میں نے انھیں علم کا نہ ختم ہونیوالا سمندر پایا۔[۳۳]

نویں فقیہ خاتون

بنت زید بن ثابت انصاری

مشہور ومعروف صحابی کاتبِ وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی دختر کو بہت سے حضرات نے فقیہ کہا ہے، رہی یہ بات کہ حضرت زید بن ثابت کی کون سی بیٹی مراد ہے؟ تو اس میں کچھ اختلاف ہے۔ علامہ ابن ملقن نے اس کا نام ام سعد لکھا ہے[۳۴]؛ جب کہ حافظ ابن حجر نے ام کلثوم کہا ہے۔[۳۵]

بنت زید بن ثابت کی فقاہت

حافظ ابن حجر نے انھیں فقیہ کہا ہے، امام بخاری نے حیض سے متعلق ان کی روایت تعلیقاً ذکر کی ہے اور امام مالک نے متصلاً نقل کی ہے۔[۳۶]

دسویں فقیہ خاتون

حضرت معاذہ عدویہ

حضرت معاذہ بنت عبداللہ عدویہ نہایت پرہیزگار، عبادت گزار اور ذی علم خاتون تھیں، بڑے

بڑے محدثین نے ان سے علم حاصل کیا، جن میں ایوب سختیانی، جعفر بن کیسان اور یزید الرشک شامل ہیں۔ صبر اور رضا بالقضاء کا یہ عالم تھا کہ جب ان کے شوہر حضرت صلہ بن اشیم اور بیٹا ایک جنگ میں شہید ہوئے تو بعض خواتین ان کے پاس تعزیت کرنے آئیں، آپ نے ان سے فرمایا: اگر تم مجھے مبارک باد دینے آئی ہو تو میں تمہیں خوش آمدید کہتی ہوں؛ لیکن اگر کسی اور نیت سے آئی ہو تو تمہارا واپس لوٹ جانا ہی بہتر ہے۔ سن 83ھ میں ان کی وفات ہوئی۔(۳۷)

حضرت معاذہ عدویہ کی فقاہت

علامہ ذہبی(۳۸) اور ہجرانی نے انھیں فقیہ کہا ہے۔(۳۹) مشہور محدث جعفر بن کیسان کہتے ہیں کہ میں نے معاذہ عدویہ کو دیکھا کہ وہ پردے میں تھیں، اور خواتین ان سے مختلف سوالات کر رہی تھیں۔(۴۰)

خلاصہ کلام

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں مرد و عورت کو یکساں حکم دیا ہے، علمی میدان میں خواتین مرد حضرات سے پیچھے نہیں، اس بات کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ قرنِ اول یعنی پہلی صدی ہجری میں ہی خواتین کی ایک بڑی جماعت کے فقیہ ہونے کی بڑے بڑے اہلِ علم حضرات نے گواہی دی ہے۔

❊ ❊ ❊

حواشی

(١) سير أعلام النبلاء الذهبي، (3/426)، الناشر: دار الحديث– القاهرة، ط:1427هـ–2006م.

(٢) تهذيب التهذيب لابن حجر، (12/384)، الناشر: دار الفكر بيروت، ط:1404هـ –1984م.

(٣) الإجابة عما استدركته عائشة على الصحابة للزركشي، (ص: 37)، الناشر: المكتب الإسلامي بيروت، ط:1390هـ–1970م

(٤) سنن الترمذي، كتاب المناقب، باب فضل عائشة رضى الله عنها، (6/188)، رقم الحديث:3883، الناشر: دار الغرب الإسلامي بيروت، ط:1998م.

(٥) المستدرك على الصحيحين للحاكم، (4/15)، الناشر: دار الكتب العلمية– بيروت، ط:1411هـ–1990م.

(٦) الاستيعاب فى معرفة الأصحاب لابن عبد البر، (4/1883)، الناشر: دار الجيل– بيروت، ط:1412هـ–1992م.

(٧) تهذيب التهذيب لابن حجر، (12/386).

(٨) معرفة الصحابة للأصبهاني، (6/3218)، الناشر: دار الوطن الرياض، ط:1419هـ–1998م– وأسد الغابة فى معرفة الصحابة للجزرى، (7/278)، الناشر: دار الكتب العلمية، بيروت.

(٩) سير أعلام النبلاء للذهبي، (2/203).

(١٠) الأعلام للزركلي، (8/97)، الناشر: دار العلم للملايين، ط:2002م.

(١١) أسد الغابة لابن الأثير الجزرى، (7/57).

(١٢) الاستيعاب لابن عبد البر، (4/1804).
(١٣) نساء حول الرسول، محمد برهان، (ص:37)، الناشر: دار الجيل.
(١٤) المصنف لعبد الرزاق،كتاب الطهارة، باب سؤر المرأة، (1/106)، رقم الحديث: 377، الناشر: المكتب الإسلامی- بيروت - والمصنف لابن أبی شيبة، كتاب الطهارة، من كره أن يتوضأ بفضل وضوئها، (1/38)، الناشر: مكتبة الرشد الرياض.
(١٥) الاستيعاب لابن عبد البر، (4/1855).
(١٦) سير أعلام النبلاء للذهبی، (4/301).
(١٧) الاستيعاب لابن عبد البر، (4/1855) وأسد الغابة للجزری، (7/132)
(١٨) تهذيب التهذيب لابن حجر، (12/450)، رقم الترجمة: 2801 .
(١٩) أسد الغابة لابن الأثير الجزری، (7/224)، رقم الترجمة: 7193 .
(٢٠) الأعلام للزركلی، (5/131).
(٢١) مستخرج أبی عوانة، كتاب الطلاق، باب الأخبار التی لاتجعل للمطلقة ثلاثاً علی زوجها نفقة ولا سكنی، (3/181)، الناشر: دار المعرفة بيروت، ط:1419ھ-1998م.
(٢٢) تهذيب التهذيب لابن حجر، (12/381)، رقم الترجمة: 8978.
(٢٣) الوافی بالوفيات للصفدی، (16/190)، الناشر: دار إحياء التراث العربی بيروت، ط:1420ھ -2000م.
(٢٤) سير أعلام النبلاء للذهبی، (4/474).
(٢٥) تهذيب التهذيب لابن حجر، (12/381) - والكاشف للذهبی، (2/512)، رقم الترجمة: 7027، الناشر: دارالقبلة- جدة، ط:1413ھ -1992م.
(٢٦) تهذيب الكمال فی أسماء الرجال للمزی، (35/352)، رقم الترجمة: 7974، الناشر: مؤسسة الرسالة بيروت، ط:1400ھ-1980م.
(٢٧) صحيح البخاری، كتاب الأذان، باب سنة الجلوس فی التشهد، (1/165)، الناشر: دار طوق النجاة، ط:1422ھ.
(٢٨) تهذيب الكمال للمزی، (35/355)، رقم الترجمة: 7974.
(٢٩) تهذيب الأسماء واللغات للنووی، (2/623)، الناشر: دار الفكر بيروت، ط:1996م.
(٣٠) تهذيب الكمال للمزی، (12/439)- والأعلام للزركلی، (5/72).
(٣١) تاريخ الإسلام للذهبی، (2/1151)، رقم الترجمة: 163، الناشر: دار الغرب الإسلامی، ط:2003.
(٣٢) قلادة النحر فی وفيات أعيان الدهر للهجرانی، (1/506)، الناشر: دار المنهاج جدة، ط:1428ھ-2008م.
(٣٣) سير أعلام النبلاء للذهبی، (4/508)، الناشر: مؤسسة الرسالة- بيروت، ط:1405ھ-1985م.
(٣٤) التوضيح لشرح الجامع الصحيح لابن الملقن، (5/103)، الناشر: دار النوادر دمشق، ط:1429ھ-2008م.
(٣٥) فتح الباری لابن حجر، (1/420)، الناشر:دار المعرفة بيروت، ط:1379ھ.
(٣٦) تهذيب التهذيب لابن حجر، (12/512).
(٣٧) سير أعلام النبلاء للذهبی، (4/509)- وتهذيب الكمال للمزی، (35/307).
(٣٨) العبر فی خبر من غبر للذهبی، (1/92)، الناشر: دار الكتب العلمية بيروت.
(٣٩) قلادة النحر فی وفيات أعيان الدهر للهجرانی، (2/12).
(٤٠) العلل ومعرفة الرجال للإمام أحمد بن حنبل، (3/80)، الناشر: المكتب الإسلامی بيروت، ط:1408ھ-1988م.

❋ ❋ ❋

مسائل وفتاویٰ

سوال: فیروزہ کی انگوٹھی پہننا کیسا ہے؟

بسم الله الرحمن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق:- فیروزہ کے نگ والی انگوٹھی پہنا جائز ہے؛ بہ شرطیکہ فیروزہ پتھر کو کسی قسم کے جانی یا مالی نفع ونقصان میں مؤثر نہ سمجھا جائے؛ کیوں کہ کسی پتھر میں نفع ونقصان یا تاثیر کا عقیدہ غلط ہے؛ بلکہ غیر اسلامی ہے؛ چناں چہ صحیح مسلم شریف میں حجر اسود کے بارے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مشہور ارشاد گرامی آیا ہے: واللّٰہ إني أقبلك وأني أعلم أنك حجر وأنك لا تضر ولا تنفع إلخ، یعنی حجر اسود میں بھی نفع ونقصان کی تاثیر نہیں ہے۔

نیز مرد کے لیے ضروری ہے کہ فیروزہ پتھر کا نگ صرف چاندی کی انگوٹھی میں ہو، سونے کی انگوٹھی میں نہیں اور اس انگوٹھی کا وزن ساڑھے چار ماشہ، یعنی: ۴رگرام، ۳۷۴ملی گرام سے زیادہ نہ ہو؛ بلکہ اگر اس سے کچھ کم ہو تو بہتر ہے۔

اور اگر کسی علاقے میں فیروزہ پتھر میں تاثیر کا عقیدہ عام ہے یعنی: عام طور پر لوگ اسی عقیدے سے فیروزہ پتھر کے نگ والی انگوٹھی پہنتے ہیں، تو وہاں صحیح العقیدہ لوگوں کو بھی بر بنائے تشبہ اس سے احتراز کرنا چاہیے۔

(ولا يتحلى) الرجل (بذهب وفضة) مطلقاً (إلا بخاتم إلخ) (الدر المختار مع رد المختار، کتاب الخطر والإباحة، فصل فی اللبس ۹:۵۱۶، ط: مکتبة زکریا دیوبند).

(ولا يتختم) إلا بالفضة لحصول الاستغناء بها فيحرم بغيرها كحجر إلخ (وذهب وحديد وصفر) ورصاص وزجاج وغيرها إلخ ولا يزيده على مثقال (المصدر السابق ۹:۵۱۷-۵۲۰)

قوله: "ولا يزيده على مثقال": وقيل: لا يبلغ به المثقال، ذخيرة. أقول: ويؤيده نص الحديث السابق من قوله عليه الصلاة والسلام: "ولا تتمه مثقالاً" (رد المحتار).

وينبغي أن تكون فضة الخاتم المثقال ولا يزاد عليه، وقيل: لا يبلغ به المقال، وبه ورد الأثر كذا في المحيط (الفتاوى الهندية، کتاب الکراهية، الباب العاشر في استعمال الذهب والفضة،

۵:۳۳۵، ط: المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق، مصر).

نقل صاحب الأجناس: لا بأس للرجل أن يتخذ خاتمًا من فضة فصه منه، وإن جعل فصه منه من جزع أو عقيق أو فيروزج أو ياقوت أو زمرد فلا بأس إلخ (حاشية الشلبي على التبيين، كتاب الكراهية، فصل فى اللبس، ٦:١٥،١٦، ط: المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق، مصر نقلًا عن الإتقانى).

عن ابن عمر رضى الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من تشبه بقوم فهو منهم" (سنن أبى داود، كتاب اللباس، باب فى لبس الشهرة، ٢:٥٥٩، رقم:٤٠٣١، ط: دار الفكر بيروت، مشكاة المصابيح، كتاب اللباس، الفصل الثانى، ص:٣٧٥، ط: المكتبة الأشرفية ديوبند).

(من تشبه بقوم) أى: من شبه نفسه بالكفار مثلاً فى اللباس وغيره أو بالفساق أو الفجار إلخ (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، ٨:٢٢٢، ط: دارالكتب العلمية بيروت)

فقط والله تعالىٰ أعلم

محمود حسن بلندشہری غفرلہٗ

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

۱۴۴۴/۱/۳۰ھ=۲۰۲۲/۸/۲۹ء

الجواب صحیح:

حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، فخر الاسلام

مفتیانِ دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند

رضاعی بھانجے سے پردہ:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے اپنی بہن فاطمہ سے ایک بچہ گود لیا ہے، بچے کے بالغ ہونے کے بعد زید کی بیوی کا اس بچہ سے پردہ کرنا ایک مشکل ترین امر ہے اور زید کی بیوی دودھ پلانے کی حالت میں بھی نہیں ہے کہ جس سے حرمت رضاعت ثابت ہو جائے؛ لہٰذا زید چاہتا ہے کہ اپنی بیوی کی بہن (سالی) سے اس بچے کو دودھ پلوادے؛ تاکہ زید کی بیوی اس بچہ کی رضاعی خالہ بن جائے تو کیا ایسا کرنے کے بعد بعد البلوغ پردہ کرنے کا حکم ساقط ہوگا یا نہیں۔ خلاصہ یہ رضاعی بھانجے سے پردہ ثابت ہے یا نہیں؟ تشفی بخش جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔ فقط والسلام

المستفتی: کاشف مظاہری

پتہ: دارالعلوم ٹانڈہ رامپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق:- شریعت میں نسبی بھانجے کی طرح رضاعی بھانجہ بھی محرم ہے، یعنی: رضاعی بھانجے سے نکاح نہیں ہوسکتا، پس اُس سے پردہ نہیں، یا یوں کہا جائے کہ شریعت میں

نسبی خالہ کی طرح رضاعی خالہ بھی حرام ہوتی ہے، رضاعی بھانجے کا اس سے پردہ نہیں، پس صورت مسئولہ میں اگر زید کی بیوی کی بہن (سالی) نے زید کی بہن: فاطمہ کے بچے (زید کے بھانجے) کو شیرخوارگی کی مدت میں (چاند کے حساب سے ۲؍سال کے اندر اندر) دودھ پلا دیا، تو وہ زید کی بیوی کے لیے رضاعی بھانجہ ہو جائے گا اور زید کی بیوی اُس کے لیے رضاعی خالہ اور پردے کے لائق ہونے پر دونوں کے درمیان شرعی پردہ نہ ہوگا۔

قال اللّٰه تعالی: ﴿وأخوتكم من الرَّضاعة﴾ (سورة النساء، رقم الآية:٢٣).

(و) حرم (الكل) مما مر تحريمه نسباً ومصاهرة (رضاعًا) إلا ما استثني في بابه (الدر المختار مع رد المحتار، كتاب النكاح، فصل في المحرمات، ٤:١٠٥، ط: مكتبة زكريا ديوبند، ٨:١٠٥، ت: الدكتور حسام الدين بن محمد صالح فرفور، ط: دمشق).

يحرم على الرضيع أبواه من الرضاع وأصولهما وفروعهما من النسب والرضاع جميعًا..... فالكل إخوة الرضيع وأخواته وأولادهم أولاد إخوته وأخواته وأخو الرجل عمه وأخته عمته وأخو المرضعة خاله وأختها خالته..... كذا في التهذيب (الفتاوى الهندية، كتاب الرضاع، ١:٣٤٣، ط: المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق، مصر) فقط واللّٰه تعالىٰ أعلم

الجواب صحيح: محمود حسن بلند شہری غفرلہٗ

حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، فخر الاسلام — دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

مفتیانِ دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند — ۱۴۴۴/۲/۱۴ھ=۲۰۲۲/۹/۱۲ء

کھانے کے بعد پانی پینا:

سوال: میں نے سوشل میڈیا پر بہت سی ویڈیوز دیکھی ہیں کہ کھانے کے آدھے گھنٹے بعد پانی پینا سنت ہے اور میرے معاشرے میں بہت سے لوگ اس کو سنت کے طور پر مانتے ہیں۔ میں نے اس کے متعلق کوئی حدیث نہیں سنی، تو میرا سوال یہ ہے کہ کیا کھانے کے بعد پانی پینا سنت ہے؟ براہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم

الجواب وباللہ التوفیق: -حضرت اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول مبارک یہ تھا کہ آپ کھانے کے بعد پانی نوش نہیں فرماتے تھے، نیز طبی اعتبار سے بھی کھانے کے بعد پانی پینا نقصان دہ ہے بالخصوص ٹھنڈا یا گرم پانی اور اگر کبھی پانی کا شدید تقاضہ ہو، تو سادہ پانی استعمال کیا جائے، ٹھنڈا یا گرم پانی استعمال نہ کیا جائے۔

ولم يكن من هديه [صلى اللّٰه تعالى عليه وسلم] أن يشرب على طعامه فيفسده ولا سيما إن كان الماء حارًا أو باردًا؛ فإنه ردئ جدًا....... ويكره شرب الماء عقيب الرياضة والتعب وعقيب الجماع وعقيب الطعام وقبله وعقيب أكل الفاكهة .... فهذه كله مناف لحفظ الصحة إلخ (زاد المعاد في هدي خير العباد [صلى اللّٰه تعالى عليه وسلم] قبيل فصل في هديه صلى اللّٰه تعالى عليه وسلم في الشرب وآدابه، ٤: ٢٢٤، ت: شعيب الأرنؤوط وعبد القادر الأرنؤوط، ط: مؤسسة الرسالة، بيروت).

اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے بعد پانی نوش نہ فرماتے؛ کیوں کہ مضر ہضم ہے، جب تک کھانا ہضم کے قریب نہ ہو، پانی نہ پینا چاہیے (**مدارج النبوۃ**)۔ (اسوۂ رسول اکرم صلی الہ علیہ وسلم، ص:۱۱۴، ۱۱۵، مطبوعہ: ادارۃ الرشید، بنوری ٹاؤن، کراچی)۔

نیز ص:۱۱۶ پر ہے:

کھانے کے بعد پانی پینا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں ہے، خصوصاً اگر پانی گرم ہو یا زیادہ سرد ہو؛ کیوں کہ یہ دونوں صورتیں بہت زیادہ نقصان دہ ہوتی ہیں (زادالمعاد۔ حوالہ بالا ص:۱۶)۔

اور مدارج النبوۃ میں ہے:

وآں حضرت آب بر طعام نمی خورد کہ مفسد است وتا طعام بانہضام نیارد آب نباید خورد (مدارج النبوۃ، ۱:۵۴۱، مطبوعہ: منشی نول کشور، کان پور)

فقط واللّٰہ تعالیٰ أعلم

محمود حسن بلند شہری غفرلہٗ
دارالافتاء دارالعلوم دیوبند
۱۴۴۴/۲/۱۷ھ = ۲۰۲۲/۹/۱۵ء

الجواب صحیح:
حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، فخر الاسلام
مفتیانِ دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند

کمیٹی میں جمع شدہ رقم سے کم لینا:

سوال:- ایک کمیٹی ہے جو اپنے ممبر سے ماہانہ اقساط وصول کرتی ہے اور پھر جمع شدہ رقم کو نیلامی کے ذریعے ان ہی 10 ممبران میں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر 10 ممبران ہیں، ہر ایک ممبر 100 کا حصہ ڈالتا ہے۔ ہر ماہ 1000 روپئے جمع ہوتے ہیں۔ اور وہ ایک ہزار روپئے کسی بھی کم رقم پر نیلام ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر 10 ممبروں میں سے کسی ایک کامیاب ممبر کو ایک ہزار روپئے 900 روپے میں فروخت کیے جاتے ہیں۔ اور پھر 100 روپئے باقی 9 ممبران میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اور کمیٹی اپنے 10 ماہ مکمل ہونے تک جاتی ہے۔ براہ کرم بتائیں کہ یہ صحیح ہے یا غلط؟

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: -ایک ہی ملک کی کرنسی میں کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ بلاشبہ سوداور حرام ہے، یعنی: اگر کوئی شخص کسی کو بہ طورادھار نوسوروپے دے اور بعد میں ایک ہزارروپے وصول کرے، یا دس ماہ تک ماہانہ ہزارروپے وصول کرے، جس کے نتیجے میں لین دین میں کمی بیشی پائی جائے، تو یہ بلاشبہ سودی معاملہ ہے۔

پس سوال نامے میں ماہانہ کمیٹی کسی ممبر کو کٹوتی کے ساتھ دینے کی جو شکل ذکر کی گئی ہے، وہ بلاشبہ سودی شکل اور حرام ہے اور کسی مسلمان کے لیے ایسی کمیٹی چلانا، یا اُس میں شرکت کرنا جائز نہیں اور جن لوگوں نے اب تک ماہانہ کمیٹی میں فاضل رقم حاصل کی ہے، اُن پر ضروری ہے کہ وہ فاضل رقم اُس کے مالکان کو واپس کریں، توبہ واستغفار کریں اور آئندہ اس قسم کی کمیٹیوں میں شرکت سے پرہیز کریں۔

قال اللّٰہ تعالی: ﴿وأحل اللّٰہ البیع وحرم الربا﴾ (سورة البقرة، رقم الآیة:۲۷۵).

عن جابر بن عبد اللّٰہ رضي اللّٰہ عنھما قال: "لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه و سلم آکل الربوا ومؤکله وکاتبه وشاھدیه، وقال: ھم سواء" (الصحیح لمسلم، ۲:۷۲، ط: المکتبة الأشرفیة دیوبند).

﴿وَلَا تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ أی: بالحرام، یعنی بالربا، والقمار، والغصب والسرقة (معالم التنزیل ۲:۵۰).

الربا فضل خال عن عوض بمعیار شرعي مشروط لأحد المتعاقدین في المعاوضة (تنویر الأبصار مع الدر والرد، کتاب البیوع، باب الربا، ۷:۳۹۸-۴۰۱، ط: مکتبة زکریا دیوبند، ۱۵:۲۱۹-۲۲۳، ت: الدکتور حسام الدین بن محمد صالح فرفور، ط: دمشق).

قال اللّٰہ تعالی: ﴿ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان﴾ (سورة المائدة، رقم الآیة:۲).

فقط واللّٰہ تعالیٰ أعلم

محمود حسن بلندشہری غفرلہٗ
دارالافتاء دارالعلوم دیوبند
۱۴۴۴/۲/۱۷ھ=۲۰۲۲/۹/۱۵ء

الجواب صحیح:
حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، فخرالاسلام
مفتیانِ دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند

عقدِ شرکت میں نفع کی تعیین:

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

زید نے ۲/لاکھ روپئے تجارت کی غرض سے دے کر عمرو کے ۲۰/لاکھ سے متجاوز کاروبار میں

شرکت کی اور عمرو کا ہارڈ ویئر کا کاروبار ہے اور ابتداء میں منافع کا فیصد طے نہیں کیا کہ کس کو کتنا فیصد ملے گا؟ زید کا کاروبار میں کوئی دخل نہیں، سارا کام عمرو دیکھتا ہے؛ البتہ زید کی شرکت کی بنا پر ہر ماہ اسے کچھ رقم دے دیتا ہے۔

جیسے کبھی پانچ ہزار، کبھی چھ ہزار.....اور یہ رقوم بغیر کسی حساب وکتاب کے دے دیتا ہے۔اب جواب طلب امر یہ ہے کہ کیا مذکورہ صورت جائز ہے یا نہیں؟ فقط والسلام

المستفتی: محمد آصف امروہوی متعلّم دارالعلوم دیوبند

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق :-عقد شرکت یا مضاربت میں فریقین کے درمیان نفع کا باعتبار فیصد معلوم ومتعین ہونا ضروری ہے، اور اگر نفع کی مقدار دونوں کے درمیان باعتبار فیصد معلوم ومتعین نہ ہو، تو شرکت یا مضاربت کا معاملہ درست نہیں، پس صورت مسئولہ میں دولاکھ روپے پر ماہانہ کیف ما اتفق پانچ ہزار یا چھ ہزار روپے دے دینا درست نہیں؛ بلکہ ضروری ہے کہ باعتبار فیصد نفع کی مقدار متعین کی جائے اور باقاعدہ حساب لگا کر دولاکھ روپے پر حاصل شدہ نفع حسبِ معاہدہ باہم دیانت داری کے ساتھ تقسیم کیا جائے۔

(وكون الربح بينهما شائعًا) فلو عين قدرًا فسدت...... وفي الجلالية: كل شرط يوجب جهالة في الربح أو يقطع الشركة فيه يفسدها، وإلا بطل الشرط وصح العقد اعتبارًا بالوكالة (الدر المختار مع رد المحار، كتاب المضاربة، ٨: ٤٣٣، ٤٣٤، ط: مكتبة زكريا ديوبند، ١٨: ٢٢٤-٢٢٩، ت: الدكتور حسام الدين بن محمد صالح فرفور، ط: دمشق).

ومنها أن يكون نصيب المضارب من الربح معلوماً على وجه لا تنقطع الشركة كذا في المحيط، فإن قال: "على أن لك من الربح مأة درهم أو شرط مع النصف أو الثلث عشرة دراهم" لا تصح المضاربة كذا في محيط السرخسي (الفتاوى الهندية، كتاب المضاربة، الباب الأول في تفسيرها وركنها وشرائطها وحكمها، ٤: ٢٨٧، ط: المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق، مصر)

فقط واللّٰه تعالىٰ أعلم

محمود حسن بلند شہری غفرلہٗ

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

۱۴۴۴/۲/۱۷ھ=۲۰۲۲/۹/۱۵ء

الجواب صحیح:

حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، فخر الاسلام

مفتیانِ دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند

======================